جلد ۲۱ — وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (القرآن) — شمارہ ۱۱

ماہنامہ میثاق لاہور

نومبر ۱۹۷۴ء

سرافگندیم ! بسم اللہ مجرھا و مرسھا

ایک نئی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ

★ مدیر مسؤل ★

ڈاکٹر اسرار احمد

ایم-بی-بی ایس (پنجاب) - ایم اے اسلامیات (کراچی)

★ مدیر معاون ★

مختار حسین فاروقی

بی-ایس-سی (انجنیرنگ)

★ یکے از مطبوعات ★

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۱۲- افغانی روڈ - سمن آباد - لاہور (فون: ۶۸۲۳۵)

چندہ سالانہ -/۱۰ —— اس شمارے کی قیمت فی پرچہ دو روپے

ANNEXURE 'A'

AL-KULLIAT-UL-ARABIA

INCOME & EXPENSES ACCOUNT

FOR THE PERIOD ENDING 31st DECEMBER 1973

Staff Salaries ...	4,000.00	
Office Expenses ...	55.75	
Stationery & Printing ...	82.61	
Library ...	134.30	
Other Expenses ...	276.75	
Block & Other Expenses	40.00	4,589.41
Less Admission Fee ...	416.50	
Tution Fee ...	904.50	1,321.00
	Net Expenses Rs.	3,268.41

ANNEXURE 'B'

MAKTABA

LIABILITIES:

Anjuman Khuddam-ul-Quran,Lahore	1,08,081.00
Excess of Income Over Expenses ...	1,389.00
Payable to Mr. Mohammad Jamil	88.70
Total Rs.	1,09,558,97

ASSETS :

Furniture	1,625.00	
Less Depreciation	162.50 ...	1,462.50
Stock of Books ...		72,976.48
(Valued by Management at Estimated Cost)		
Royalty		
Total Payment	30,000.00	
Less Written off	5,000.00 ...	25,000.00
Advances :		
Recoverable in cash	3,644.65	
Value to be Received :	...	
Zafar Cali Grapher	200.00	
Mohammad Bashir (جلد ساز)	5,000.00 ...	8,844.65
Cash in Hand ...		1,275.34
	Total Rs.	1,09,558.97

ماھنامہ **میثاق** لاھور

جلد ۲۱	اکتوبر نومبر ۱۹۷۴ء	شمارہ ۱۰-۱۱

فہرست مضامین

★ تذکرہ و تبصرہ ——— اسرار احمدؒ ۲

- قادیانی مسئلہ اور اس کا حل ---------- ۲
- پاکستان : احیائے اسلام کے طویل المیعاد خدائی منصوبے کی ایک اہم کڑی ---------- ۱۴
- اُمّتِ مسلمہ کے عروج و زوال کا ایک خاکہ ---------- ۲۰
- احیائی عمل اور اس کے اہم پہلو ---------- ۳۱

★ "سرافگندیم" (۲) ——— اسرار احمدؒ ۴۱

★ تنظیم اسلامی ——— ۶۱

- قرارداد ---------- ۶۲
- توضیحات ---------- ۶۴
- تقریر مولانا امین احسن اصلاحی ---------- ۷۱
- " " عبدالغفار حسن ---------- ۸۱
- مولانا امین احسن اصلاحی کا الوداعی خطاب ---------- ۹۰
- تائید و تبصرہ ---------- ۹۳

★ دعوت الی اللہ کی اہمیّت اور اس کے اصول و مبادی ——— اسرار احمدؒ ۹۶

اسرار احمد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تذکرہ و تبصرہ

(۱)

اگرچہ جس وقت ' میثاق ' کا یہ شمارہ طبع ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا، اس وقت تک قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کا فیصلہ خاصہ پرانا ہو چکا ہوگا، تاہم جی نہیں مانتا کہ ' میثاق ' کے صفحات اللہ تعالیٰ کے اس احسان عظیم پر اس تعالیٰ کی جناب میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرنے کی سعادت سے بالکل محروم رہ جائیں جو اس فیصلے کی صورت میں پوری ملت اسلامیہ پر ہوا ہے ——— اس لئے کہ اگرچہ عالم اسباب میں اس تاریخی فیصلہ کے بہت سے عوامل ہیں، تاہم واقعہ یہ ہے کہ فی الحقیقت یہ سب کچھ ایک خالص خدائی تدبیر کے نتیجے میں ہوا جس نے جملہ اسباب و عوامل کو طوعاً و کرہاً اس طرح ایک ہی رُخ میں پھیر دیا کہ اس فیصلے سے فرار کی کوئی راہ کسی کے لئے کھلی ہی نہ رہی اور بالکل معجزانہ طور پر وہ کٹھن مرحلہ طے ہو گیا جس کے طے ہونے کا کوئی امکان آج سے چھ ماہ قبل کسی بڑے سے بڑے سیاسی پنڈت کو بھی نظر نہ آ سکتا تھا۔

لہٰذا ——— اگرچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان مبارک کے مطابق کہ " مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ "[1] پوری ملت اسلامی کی جانب سے مبارکباد اور شکریے کے مستحق ہیں وہ عوام بھی جنہوں نے دینی غیرت اور حمیت کا بھرپور ثبوت بھی دیا اور صبر و تحمل اور نظم و ضبط کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا اور علماء کرام اور دینی و سیاسی جماعتوں کے رہنما اور کارکن بھی جنہوں نے نہایت منظم طریقے پر عوام کے جذبات کی ترجمانی کا فرض سرانجام دیا اور اس سلسلے میں سخت محنت اور مشقت بھی برداشت کی اور ہر طرح کے خطرات بھی مول لئے۔ یہاں تک کہ

---

[1] " جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا " (الحدیث)

قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ خصوصاً مولانا محمد یوسف بنوری جنہوں نے علالت و پیرانہ سالی اور ضعف و نقاہت کے باوجود ایسی شدید مشقت برداشت کی جس کا تحمل صحت مند اور تنومند نوجوانوں کے لئے بھی مشکل ہو، پھر مبارک باد اور شکریے کے مستحق ہیں ممبران اسمبلی اور ارکان پارلیمنٹ بھی جنہوں نے عوام کے جذبات کا بھی پورا لحاظ کیا اور خود بھی دیانت دارانہ اور حقیقت پسندانہ روش اختیار کی اور حکومت وقت بھی جس نے نہ اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنایا، نہ نوشتۂ دیوار کو پڑھنے سے انکار کیا۔ خصوصاً مسٹر بھٹو جو سیاسی تدبر اور فہم و فراست کے اس کڑے امتحان سے کامیابی کے پھریرے اڑاتے ہوئے نکلے ——— لیکن ہمارے شکر و سپاس کا اصل حقدار اور ہمارے تشکر و امتنان کا سزاوار حقیقی ہے اللہ رب العلمین جو "فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْد" بھی ہے اور "غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ" بھی اور جس کے قبضۂ قدرت میں ہیں تمام اسباب و علل اور جملہ وسائل و عوامل "فَلَہُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَہُ الْحَمْدُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃ"۔

جیسا کہ قارئین "میثاق" کو معلوم ہے، راقم الحروف ۲۴ مئی سے ۳۰ جون تک تقریباً مسلسل لاہور سے باہر رہا۔ پہلے کچھ بحالی صحت اور کچھ بعض معاملات و مسائل پر گوشہ تنہائی میں غور و فکر کے پیش نظر ایک سفر ایبٹ آباد اور وادیٔ کاغان کا ہوا، پھر ایک طویل دورہ کراچی اور سندھ کے بعض دوسرے شہروں کا رہا، اسی دوران میں جب "حادثہ ربوہ" کی خبر پڑھی تو فوراً جو خیال دل میں پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ غالباً تقدیر الٰہی میں فتنہ قادیانیت کی جس قدر مہلت طے تھی وہ پوری ہو چکی اور یہ رسّی جتنی دراز ہونی مقدر تھی وہ ہو چکی۔ آج سے اس کے زوال کا آغاز ہو گیا، گویا ایک انگریزی محاورے کے مطابق "THIS IS THE BEGINNING OF THEIR END!" تبھی تو ان کی عقل ماری گئی اور ایسے ہوشیار اور کیا دو شاطر گروہ کے ہاتھوں اتنی بڑی حماقت کا ارتکاب ہو گیا۔ چنانچہ اثنائے سفر میں نجی گفتگوؤں میں بھی راقم اپنے اس تاثر کا اظہار کرتا رہا اور جب ۲۸ جون کو سکھر کی نئی تعمیر شدہ لیکن قدیم بادشاہی طرز کی عظیم جامع مسجد میں اجتماع جمعہ سے خطاب کا موقع ملا تو وہاں بھی راقم نے اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ یہ ایک خالص خدائی تدبیر ہے اور اس بارے یہ مسئلہ انشاء اللہ العزیز یہ ضرور تسلی بخش طریقے پر طے ہو جائے گا اور پھر جیسا تقریباً ڈیڑھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد راقم نے ۵ جولائی کو جامع مسجد خضراء سمن آباد میں پہلا جمعہ پڑھایا تو اس موقع پر بھی ایک مفصل تقریر میں پھر اسی توقع کا اظہار کیا۔ یہ تقریر جو اتفاقاً ٹیپ کر لی گئی تھی، رفقاء و احباب نے اپنے حسن نظر کے باعث بہت پسند کی،

اور محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے سخت محنت جھیل کر اسے صفحۂ قرطاس پر بھی منتقل کر لیا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ اسے 'میثاق' میں شائع کر دیا جائے لیکن اس وقت سنسر کی پابندی کے باعث ان کی یہ خواہش پوری نہ کی جا سکی۔ ذیل میں اس کا ابتدائی حصہ درج کیا جا رہا ہے تاکہ ایک تو ان کی خواہش پوری ہو جائے اور ان کی محنت سپھل ہو اور دوسرے یہ نہ کہا جا سکے کہ ہمارے یہ خیالات وقوعہ کے پیش آ چکنے کے بعد کی خیال آرائیوں کے قبیل سے ہیں۔

(تقریر کا بقیہ حصہ جو "عقیدۂ ختم نبوت اور قرآن حکیم" کے موضوع پر اظہار خیال پر مشتمل ہے انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں شائع کر دیا جائے گا!) :-

"حمد و ثنا اور تلاوتِ آیات کے بعد عرض کیا گیا :-

حضرات! ۲۴ مئی کے بعد آج ۵ جولائی کو ملاقات ہو رہی ہے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ ادھر تو جمعہ کے ان اجتماعات میں میرے خطابات کا سلسلہ عارضی طور پر لاہور سے باہر جانے کے سبب سے معطل ہوا اور اُدھر ملک میں ایک نہایت ہیجان انگیز واقعہ پیش آ گیا۔ یعنی حادثۂ ربوہ — اور اس کے بعد پوری شدت کے ساتھ اس مسئلے نے سر اٹھایا جو اگرچہ موجود تو تقریباً ایک صدی سے ہے لیکن جس کا شدت کے ساتھ احساس آج سے تقریباً اکیس سال قبل ۱۹۵۳ء میں ہوا تھا۔ لیکن ۵۳ء کے حوادث کے بعد یہ مسئلہ دوبارہ بالکل دب گیا تھا اور بجز اس کے کہ بعض افراد جیسے جناب شورش کاشمیری اور ہمارے بزرگ حکیم عبدالرحیم اشرف اس کی فتنہ سامانی کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے یا بعض غیر اہم قسم کے ادارے وقتاً فوقتاً کچھ کتابچے اور پمفلٹ اس کے بارے میں شائع کرتے رہتے تھے۔ کوئی عوامی تحریک اس مسئلے کے بارے میں موجود نہ تھی۔ اب ربوہ کے اس حادثہ نے اس کو از سرِ نو زندہ کر دیا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلی مرتبہ اس کی حقیقی فتنہ انگیزی، اس کی سازشی فطرت اور اس کی مکاری کا ملک گیر احساس اجاگر ہوا اور ایوانِ حکومت سے لے کر خواص و عوام سب کی توجہ ادھر مبذول ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس مرتبہ جو یہ مسئلہ اٹھا تو وہ کسی سیاسی پارٹی کی کوشش اور محنت سے نہیں اٹھا بلکہ میں نے جہاں تک حالات کا تجزیہ کیا ہے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ خالص ایک خدائی تدبیر ہے کہ اس طائفے کی عقل ماری گئی اور اس نے خود ہی اپنے ایک انتہائی غلط اقدام سے اس مسئلے کو زندہ کر دیا!

یہ فتنہ اپنے سازشی کردار اور خاموشی لیکن انتہائی مہارت اور مشاقی کے ساتھ جسدِ ملت میں سرطان کے پھوڑے کی طرح جڑیں جمانے کے اعتبار سے پوری ملت اسلامیہ کی تاریخ میں منفرد مقام

رکھتا ہے اور عام طور پر اس کی ہلاکت انگیزی کا لوگوں کو اندازہ نہ تھا بلکہ تعلیم یافتہ حضرات میں سے بھی اکثر لوگ اس سے بالکل ناواقف تھے یا اس کے بارے میں گوناگوں غلط فہمیوں میں مبتلا تھے۔ اس مرتبہ جو یہ مسئلہ اٹھا ہے تو اگرچہ قادیانیوں نے تو اس کا کریڈٹ بھٹو صاحب کو دینے کی کوشش کی ہے تاہم اسے بھی ان کی سابقہ مکاریوں کا ایک تتمہ یا ضمیمہ ہی سمجھنا چاہیئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس دفعہ اس مسئلہ کے ابھرنے اور اٹھنے میں نہ حکومت کا کوئی عمل دخل ہے نہ کسی اپوزیشن پارٹی کا ہاتھ، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ علماء کی کسی تنظیم یا جماعت کا بھی اس میں کوئی دخل نہیں ہے! اور حقیقت یہ ہے کہ اس بار اس کے کریڈٹ کا کوئی شخص اور کوئی سیاسی پارٹی دعویٰ نہیں کر سکتی۔ بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس مرتبہ یہ مسئلہ ایک خالص خدائی تدبیر کے تحت اٹھا ہے اور اس کا کریڈٹ اگر کسی کو پہنچتا ہے تو وہ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات گرامی ہے۔

میرے اس یقین کی بنیاد یہ حقیقت ہے کہ اس مرتبہ قادیانیوں کی طرف سے ربوہ سٹیشن پر جو اقدام ہوا وہ ان کے اپنے اساسی فلسفے، بنیادی طریق کار اور اپنے سابق طرز عمل سے بالکل مختلف ہے ان کا رویہ اور طریقہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ حکومتِ وقت کو سلام کرو اور اس کی کاسہ لیسی، مدح سرائی اور اس کی ثنا خوانی کر کے اس سے مراعات حاصل کرو اور ان مراعات کے تحت غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر اپنی جڑیں پھیلاؤ۔ اُمّت مسلمہ سے براہ راست تصادم سے ہمیشہ کنی کترانا ان کا وطیرہ رہا ہے۔ یہی ان کا ابتدا سے فلسفہ ہے، یہی ان کا طریق کار ہے۔ انہوں نے نہ کبھی سیاسی میدان میں خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی کسی موقع پر جارحیت کا کوئی انداز اختیار کیا۔ اس لئے کہ سیاست کا مبتدی طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی جمعیتیں اور جماعتیں یا فرقے اور گروہ کسی ملک میں بھی جارح ہو کر نہیں جی سکتے۔ مظلوم و مجروح ہو کر رہنے میں تو پھر بھی ان کے زندہ رہنے کا امکان رہتا ہے۔ جارحیت کی صورت میں تو سوائے خاتمے کے اور کوئی صورت ہی نہیں۔ یہی فلسفہ تھا جس کے سہارے یہ آج تک پنپتے رہے ہیں۔ اسی فلسفے پر وہ انگریزی دور میں پوری طرح کاربند رہے۔ حکومت برطانیہ کی قصیدہ گوئی، اس کی خوشامد، اس کو رحمتِ خداوندی قرار دے کر اس کو بقا و ترقی کی دعائیں دے کر، اس کے مقاصد و مفادات میں مدّ و معاون ہو کر، اس کے زیر سایہ اور زیر عاطفت رہ کر اور اس سے مراعات حاصل کر کے جسدِ ملت میں یہ سرطان کے مانند اپنی جڑیں پھیلاتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی یہ اسی طریق کار پر عمل پیرا رہے ہیں کہ خواہ کوئی بھی حکومت ہو اور کوئی بھی شخص یا جماعت برسر اقتدار ہو خود کو اس کا وفادار ثابت کریں اور خوشامد کے ذریعے

مراعات پر مراعات حاصل کرتے چلے جائیں۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ نہ صرف ان کی طرف سے جارحیت کا ارتکاب ہوا بلکہ انہوں نے اس جارحیت کو وقت کی حکمران سیاسی پارٹی سے منسوب کرنے کی حماقت کر کے حکومتِ وقت کو اپنے مدِ مقابل لا کھڑا کیا۔ گویا ان کی حماقت کے نتیجے میں حکومت اور عوام دونوں ایک صف میں کھڑے ہو گئے اور حکومت اور عوام بلکہ حکمران جماعت اور اپوزیشن کے مابین کسی قسم کی سیاسی غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان ختم ہو گیا۔ لہٰذا ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ ایک طرف تو یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا دوسری طرف خود بخود حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ حکومت اور عوام سیاسی پارٹیوں کی باہمی کشاکش کی نوبت آئے بغیر یہ امید ہو چلی ہے کہ اس مرتبہ انشاء اللہ اس مسئلہ کا ایسا حل ضرور نکل آئے گا جو امت کے لئے قابل قبول ہو۔ اس سے پہلے کبھی ایسی صورت حال رونما نہیں ہوئی کہ اس مسئلے کے حل کی طرف کوئی ادنیٰ سا اقدام بھی ہوا ہو لیکن اس مرتبہ تائید ایزدی سے ایسے حالات خود بخود پیدا ہو گئے ہیں کہ انشاء اللہ العزیز اس بار یہ مسئلہ کھٹائی میں نہیں پڑ سکے گا۔ اس لئے کہ بحمد اللہ اس حد تو معاملہ آ گیا ہے کہ ایک طرف ایک اعلیٰ سطحی تحقیقاتی عدالت کا تقرر ہوا ہے جس کے TERMS OF REFERENCE کافی وسیع کر دیئے گئے ہیں، تمام معاملات اس عدالت کے سامنے لائے جا رہے ہیں۔ اگر یہ عمل جاری رہا تو اس گروہ کا گھناؤنا کردار اس تحقیقی عدالت کے سامنے آ جائے گا اور یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ اس گروہ کا مقام دائرہ ملت کے اندر نہیں بلکہ باہر ہے۔ دوسری طرف اس ملک کے اعلیٰ ترین بااختیار ادارے یعنی ملک کی اسمبلی اور پارلیمنٹ میں بھی اس مسئلے پر باقاعدہ غور و فکر شروع ہو گیا ہے۔ یہ دونوں صورتیں اس مسئلہ کے صحیح حل کے لئے نہایت مناسب ہیں اس وقت اس بات سے بالکل قطع نظر کر لیجئے کہ اس مسئلہ کے حل سے کس کا کیا مفاد وابستہ ہے۔ حکمران پارٹی کیا چاہتی ہے اور اپوزیشن پارٹیاں کیا چاہتی ہیں؟ ان سب سے صرف نظر کرتے ہوئے میں یہ بات عرض کرتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے شکر کا مقام ہے کہ اس مسئلہ کے حل کے لئے قانونی اور دستوری طور پر جو صحیح اقدامات کئے جا سکتے ہیں وہ کر لئے گئے ہیں اور یہ امید پیدا ہو چلی ہے کہ اس مرتبہ یہ مسئلہ انشاء اللہ ضرور حل ہو جائے گا۔

البتہ اس موقع پر تین احتیاطوں کی سخت ضرورت ہے:

ایک احتیاط تو عوام کو کرنی چاہیئے کہ معاملہ کسی صورت میں بھی ہنگامہ، ایجی ٹیشن اور دنگے فساد کی شکل اختیار نہ کرنے پائے اس لئے کہ یہ قادیانیوں کے جال میں پھنسنے کے مترادف ہو گا۔ بعض معتبر

ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں بھی قادیانیوں نے پاکستان سے نقل مکانی کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی یہ کوشش بھی تھی کہ کسی طرح ہنگامہ کی صورت پیدا ہو اور حکومت اور عوام کے مابین شدید نوعیت کا تصادم پیدا ہو جائے اور جب وہ اس میں کامیاب ہو گئے اور مارشل لاء لگ گیا تو وہ جو چاہتے تھے وہ ہو گیا اور ان کے قدم جم گئے۔ اب بھی ان کی طرف سے اشتعال انگیزی کی جا رہی ہے۔ اب تک جہاں بھی فساد اور لوٹ مار کا معاملہ ہوا یا فائرنگ تک نوبت پہنچی وہاں ابتدا ان ہی کی طرف سے ہوتی ہے اور انہوں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اس کو ایک ہنگامہ خیز اور دھماکہ خیز صورت بنا دیا جائے اور حالات کا رُخ اس طرف پھیر دیا جائے کہ ملک میں LAW AND ORDER کا گھمبیر مسئلہ اٹھ کھڑا ہو تاکہ حکومت اور عوام میں خوفناک تصادم ہو جائے۔ نتیجۃً موجودہ دستوری اور آئینی نظام درہم برہم ہو جائے اور اختیارات فوج کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائیں۔ فوج کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو کسی سیاسی یا دینی مسئلہ کی تائید یا مخالفت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ خالص انتظامی معاملہ سمجھ کر LAW AND ORDER قائم کرنے کے لئے ہر قسم کی بدامنی اور ہنگامے کو فرو کر دینا اپنا فرض منصبی سمجھتی ہے لہٰذا قادیانیوں کو اسی میں اپنی عافیت نظر آتی ہے کہ ملک میں بڑے پیمانہ پر لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا کر دیا جائے اور عوام اور حکومت میں کسی طرح شدید تصادم کرا دیا جائے۔ آپ نے بھی سنا ہوگا کہ ربوہ میں کسی جگہ نمایاں طور پر یہ عبارت لکھی گئی تھی کہ "خدا اپنی فوجوں کے ساتھ آ رہا ہے" گویا انہوں نے اپنی طرف سے اس بات کا پورا اہتمام کر لیا تھا کہ کسی طرح ملک میں سول ایڈمنسٹریشن فیل ہو جائے اور فوج حکومت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں سنبھال لے تاکہ ایک طرف دستور معطل ہو جائے اور دوسری طرف وہ اپنے سازشی طور طریقوں سے فوج کو متاثر کر کے فائدہ اٹھا سکیں لہٰذا اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عوام ہر قسم کی اشتعال انگیزی پر ضبط و تحمل اور صبر سے کام لیں اور کسی وقت بھی کوئی ایسی صورت حال پیدا نہ ہونے دیں جس سے LAW AND ORDER کا مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ اگر اس موقع پر قادیانیوں کی اشتعال انگیزی کے جواب میں ہماری جانب سے بھی اسی قسم کا معاملہ ہو گیا تو درحقیقت یہ قادیانیوں کی تدبیر کی کامیابی ہوگی اور گویا ہم خود ان کے جال میں پھنس جائیں گے۔

دوسری احتیاط تمام سیاسی اور دینی پارٹیوں کو یہ کرنی چاہیئے کہ اس مسئلہ کے اٹھانے اور

اس کے حل کا کریڈٹ لینے کی کوشش سے بھرپور اجتناب کیا جائے۔ کسی سیاسی پارٹی کی جانب سے اس مسئلے سے سیاسی مفاد حاصل کرنے کی ادنیٰ سی کوشش بھی پورے معاملہ کو خراب کر سکتی ہے لہٰذا اس سے دامن بچانا از حد ضروری ہے ——— واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر کسی پارٹی کی جانب سے اس رجحان کا اظہار کہ یہ معاملہ اس کی کوششوں سے اٹھا ہے اور اس کی کامیابی کا سہرا اس کے سر بندھنا چاہیئے انتہائی تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

تیسری احتیاط یہ ہونی چاہیئے کہ کسی موقع پر بھی اس معاملہ کو حکومت اور حزب اختلاف کے مابین طاقت آزمائی کا رنگ نہ دیا جائے۔ ماضی میں ایسا ہو چکا ہے کہ اس مسئلے سے بعض گروہوں اور سیاسی پارٹیوں نے سیاسی مفادات حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کو حکومت VERSUS حزب اختلاف کا مسئلہ بنا دیا جس کے نتیجہ میں مسئلہ حل ہونے کے بجائے لاینحل بن گیا۔ اس موقع پر یہ صورت حال پیدا نہیں ہونی چاہیئے۔ اس سلسلے میں یہ بات نہایت امید افزا اور اطمینان بخش ہے اور گویا ایک نہایت نیک شگون کا درجہ رکھتی ہے کہ اس بار متحدہ مجلس عمل کی قیادت مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ کو سونپی گئی ہے جو ایک خالص غیر سیاسی شخصیت ہیں اور چاہے ملک کے ہر شہری کی طرح ان کے بھی کچھ مخصوص سیاسی نظریات ہوں بہر حال وہ عملی سیاست کے میدان سے بالکل علیحدہ رہتے ہوئے صرف علمی اور تدریسی مشاغل میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ مولانا کی قیادت میں یہ تحریک سیاست کی نذر ہونے سے بچ جائے گی اور معاملہ حکومت بمقابلہ احزاب اختلاف کا نہیں بنے گا بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر مسئلے کے حل کا کریڈٹ حکمران پارٹی لینا چاہتی ہو تو وہ بے شک لے لے۔ ہمیں ساری دلچسپی اس سے ہونی چاہیئے کہ اس مرتبہ کسی طرح یہ مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کے مطالبے کے مطابق حل ہو جائے۔ میں اسی بات کو سکھر کے ایک اجتماع میں بھی بیان کر چکا ہوں، مختلف ذرائع سے اپنی یہ گزارشات علماء کرام اور سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں تک بھی پہنچا چکا ہوں اور آج پھر اس کا اظہار کر رہا ہوں کہ اس مرتبہ یہ مسئلہ خود قادیانیوں کی حماقت سے اٹھا ہے، پورے زور شور سے اٹھا ہے۔ اس مسئلہ کے اٹھانے میں کسی سیاسی پارٹی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ خالص خدائی تدبیر ہے۔ اللہ نے ہمیں موقع عطا فرمایا ہے کہ ہم اس صورت حال سے صحیح فائدہ اٹھا لیں۔ اگر ہم نے کفران نعمت کیا تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مسئلہ کتنے طویل عرصے کے لئے دوبارہ سرد خانے میں چلا جائے۔ اس مسئلہ کو نئے سرے سے اٹھانا آسان نہیں ہوگا ۱۹۵۳ء کے بعد سے یہ مسئلہ جس

طرح دب گیا تھا وہ آپ کو معلوم ہے۔ لہٰذا اس موقع پر ہمیں پورے دینی اور سیاسی فہم کا ثبوت دینا چاہیئے اور ہر قسم کی اشتعال انگیزی پر ضبط و تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے پُرامن ذرائع سے اپنا مطالبہ جاری رکھنا چاہیئے، دلائل سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہنگامہ آرائی سے دامن بچانا چاہیئے۔ اس کو حکومت اور حزب اختلاف کے مابین نزاعی مسئلہ بنانے سے پہلوتہی کرنی چاہیئے اور اس کا کریڈٹ لینے کی کوشش سے ہر سیاسی پارٹی بالخصوص اپوزیشن کو بچنا چاہیئے۔ ہم کو یہ بات خاص طور پر پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ یہ پہلا موقع ہے کہ حکومت کی سطح پر اس فتنہ پر تشویش کا اظہار ہوا ہے اور بڑی اعلیٰ سطح پر یہ احساس اجاگر ہوا ہے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے اور اس کا صحیح حل تلاش کرنے کی واقعتاً ضرورت ہے۔ یہ صورتِ حال بڑی اطمینان بخش ہے لہٰذا ہمیں موقع دینا چاہیئے کہ ایوان نمائندگان پُرامن فضا میں اس مسئلہ کو اُس صحیح حل تک پہنچا سکے جو پوری اُمّت مسلمہ کے لئے قابل قبول ہو۔

جہاں تک اس مطالبہ کا تعلق ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول اس سے زیادہ لزوم کوئی اور مطالبہ نہیں ہو سکتا اس لئے کہ کسی کمیونٹی (COMMUNITY) کو باقاعدہ اقلیت (MINORITY) تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے بہت سے قانونی حقوق اور تحفظات دے دیئے جائیں! یہ گویا ایک اعتبار سے اس کی قانونی حیثیت کا اقرار (RECOGNITION) اور بین الاقوامی سطح پر اس کے حقوق کا اعتراف ہے۔ اگر کوئی ملک کسی کمیونٹی کو اپنے ہاں اقلیت (MINORITY COMMUNITY) کی حیثیت سے تسلیم کرلے تو گویا یونائیٹڈ نیشنز کے تمام ادارے اس کے پشت پناہ ہو گئے۔ یو این او اس کی کسٹوڈین بن گئی۔ بین الاقوامی عدالت اس کے معاملات میں مداخلت کی مجاز ہو گئی۔ بحیثیت اقلیت ان کے حقوق آپ کو باقاعدہ طے کرنے ہوں گے اور ان کو اپنی کتاب دستور میں مندرج کرنا ہو گا۔ ان حقوق کی ادائیگی کی آپ کو ضمانت دینی ہو گی اور آپ کے ملک کی عدالت عالیہ ان حقوق کی نگہداشت کرے گی۔ قادیانیوں کے لئے اس سے زیادہ فیاضانہ سلوک کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ ختم نبوت کا عقیدہ اُمّتِ مسلمہ کا ایک ایسا اجماعی عقیدہ ہے کہ اس میں کسی اعتبار سے رخنہ ڈالنا یا دراڑ پیدا کرنا ہمیشہ سے ارتداد کی ایک پختہ اور متفق علیہ بنیاد رہی ہے۔ دوسری طرف قتلِ مرتد اور خصوصاً منظم مرتدین کے ساتھ قتال کے مسئلے پر بھی ہمیشہ سے اُمّت کا اجماع ہے۔ یہ تو اس دور کی "برکات" ہیں۔ بقول اکبر الہ آبادی مرحوم کہ:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ گلے میں جو آئیں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسّر اناالحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

کہ جس نے جو چاہا کہہ دیا اور جو جی میں آیا دعویٰ کر دیا اور اُسے کوئی فکر نہیں کہ میرا حشر کیا ہوگا اور میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا؟ مرزا صاحب کے تمام دعاوی برٹش راج میں ہوتے - یہ دعوے برطانوی سامراج کے اپنے مفاد میں تھے۔ پھر مسلمانوں میں انتشار فکر و نظر اس کو عین مطلوب تھا لہٰذا وہ کیوں ان کا نوٹس لیتا اس نے تو ان کی سرپرستی کی اور خوب سرپرستی کی اس کی سرپرستی اور نگہداشت میں یہ پودا نہیں، جھاڑ جھنکار نشو و نما پاتا رہا۔ اگر کہیں خلافت راشدہ کا دور ہوتا یا کوئی بھی اسلامی حکومت ہوتی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوتا۔ ایسا دعویٰ کرنے والے کا مقام دار و رسن ہوتا یا پھر اس دعویٰ کو ماننے والوں کے ساتھ باقاعدہ قتال ہوتا۔ ان کی جان اور ان کا مال مسلمانوں کے لئے مباح قرار پاتا اور ان کے ساتھ معاملہ وہی کیا جاتا جو متحارب کفار اور مشرکین کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُمّت مسلمہ کا سینہ بڑا کشادہ رہا ہے۔ ہمارے ہاں تکفیر کا مسئلہ بہت ہی نازک مسئلہ سمجھا گیا ہے۔ عام طور پر جو یہ بات مشہور ہے کہ تکفیر ایک آسان سا معاملہ ہے تو یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ ہمارے ہاں تکفیر کا معاملہ بہت کم ہوا ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں کفر کا فتویٰ مختلف عقائد اور مختلف اعمال پر لگتا رہا ہے۔ متعیّن افراد یا گروہوں کی باقاعدہ تکفیر شاذ ہی کبھی ہوئی ہے۔ آپ کو گنتی کی مثالیں ہی ملیں گی کہ کسی اسلامی حکومت نے متعین طور پر کسی متعین شخص یا جماعت کی تکفیر کر کے اس کو جسد ملت سے کاٹ پھینکا ہو۔ ارتداد یا تکفیر کا معاملہ انہی افراد کے ساتھ کیا گیا ہے کہ جن کے قول اور عقیدہ کی کوئی تاویل اور توجیہہ ممکن ہی نہ رہی ہو اور صریح ارتداد یا کفر کا ایسا ثبوت فراہم ہوگیا ہو جس کی تردید ممکن نہ ہو پھر ایسے افراد کے ساتھ بھی انتہائی سزا یعنی قتل سے قبل پوری طرح افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں عیسائیت کی تاریخ آپ کو بتاتے گی کہ کتنی معمولی، چھوٹی اور بالکل فروعی باتوں پر کیسی کیسی بہیمانہ اور وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں اور کس طرح بے دریغ ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ ہمارا اجتماعی مزاج اس کے بالکل برعکس رہا ہے لیکن قادیانیوں کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے وہ رخنہ پیدا کیا ہے کہ اگر اس سے صرف نظر کیا گیا تو ملت کی شیرازہ بندی ممکن ہی نہیں رہے گی۔ دعویٰ نبوت درحقیقت وہ رخنہ اور فتنہ ہے کہ جس سے وہ بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے جس

پر اسلام کا قصر کھڑا ہے۔ نبوت سے کم تر درجہ کے بہت سے فتنے ہمارے ہاں اٹھتے رہے اور امت نے انہیں برداشت کیا ہے لیکن نبوت کا دروازہ وہ دروازہ ہے کہ اگر اس کو ایک ہی بار کھول دیا گیا تو منطقی طور پر امت میں تفریق کا ایک مسلسل عمل شروع ہو جائے گا جس کی کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی دعویٰ نبوت کرے تو لازماً اس کے دو نتائج مترتب ہوں گے۔ اس کو ماننے والا مومن اور اس کا انکار کرنے والا کافر قرار پائے گا۔ نبی ایک میزان اور فرقان بن کر آتا ہے وہ کفر و ایمان کا معیار بن کر آتا ہے جو اس کو نہ مانے چاہے وہ دیگر تمام باتوں کو مانتا ہو یہاں تک کہ وہ خدا کو مانتا ہو اور خالص توحید کے ساتھ مانتا ہو وہ آخرت کو مانتا ہو اور ان تمام تفاصیل کے ساتھ مانتا ہو جن کی خبر انبیاء و رسل دیتے چلے آئے ہیں۔ وہ حضرت آدمؑ سے لے کر اس نبی سے پہلے آنے والے تمام نبیوں اور رسولوں کو مانتا ہو، تمام صحیفوں اور کتابوں کو مانتا ہو، ملائکہ کو مانتا ہو، زاہد ہو، عابد ہو، بڑا ہی متقی ہو لیکن مجرد اس بات سے کہ اس نے ایک نبی کا انکار کر دیا، اس پر کفر کا ٹھپہ لگ جائے گا اور وہ مومن نہیں بلکہ کافر قرار پائے گا۔ گویا نبوت کا لازمی اور منطقی نتیجہ تفریق ہے۔ غور کیجئے کہ یہود اور نصاریٰ کے مابین آخر کیا چیز مابہ الاختلاف ہے؟ عیسائی اب بھی جس کتاب کو لئے پھرتے ہیں، اس میں انجیل (NEW TESTAMENT) کے ساتھ ساتھ عہد نامہ عتیق (OLD TESTAMENT) کے نام سے بنی اسرائیل کے انبیاء پر نازل ہونے والے تمام صحیفے شامل ہیں گویا عیسائی تورات، زبور اور تمام صحیفوں کو بھی مانتے ہیں اور حضرت آدم سے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام تک تمام نبیوں اور رسولوں کو بھی مانتے ہیں لیکن پھر بھی یہ دو علیحدہ علیحدہ امتیں ہیں۔ یہ فرق کیوں واقع ہوا؟ صرف اس لئے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ کی نبوت کا انکار کیا اور عیسائیوں نے اس کو مانا تو بنی اسرائیل میں تفریق ہو گئی۔ اب یہ دو بالکل جدا امتیں ہو گئیں۔ یہود کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کو نبی اور رسول ماننے والے دائرہ ایمان سے خارج ہو کر کافر ہو گئے اور عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کے انکار کی وجہ سے یہود کافر قرار پائے۔ مزید غور کیجئے کہ ہمارے اور عیسائیوں کے مابین فرق کیا ہے؟ یہاں میری مراد ان لوگوں سے ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا نبی اور رسول مانتے ہوں اور جو حقیقتاً حضرت مسیحؑ کے متبع ہوں۔ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہیں لیکن یہ متبعین حضرت مسیحؑ، ہمارے نبی سید المرسلین، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے لہٰذا ہمارے نزدیک وہ کافر اور ان کے نزدیک ہم کافر،

گویا یہ وہ منطقی نتیجہ ہے جس تک خود قادیانیوں نے اس مسئلے کو پہنچایا ہے جب وہ ایک نئی نبوت پر ایمان کے مدعی ہیں تو ان کے نزدیک اس نبوت کا انکار کرنے والے کافر اور ہمارے نزدیک اس نبوت کو ماننے والے کافر۔

اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ نئی نبوت کا کھڑاک مول لیا گیا؟ حقیقت یہ ہے کہ نبوت کی بنیاد پر جو تنظیم قائم ہوتی ہے اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا آپ تصور ہی نہیں کر سکتے۔ جس کسی نے کسی کو نبی مان لیا اس نے گویا ہر اعتبار سے اپنے آپ کو اس نبی کی کامل فرمانبرداری میں دے دیا اور خود کو بالکلیہ SURRENDER کر دیا۔ اور اب اس نبی کے مقابلے میں اُس کا فکر، اُس کی عقل اور اس کی رائے سب معطل ہو جائیں گے کوئی شخص جب ظلی طور پر، بروزی طور پر یا کسی اور اعتبار سے خود کو ایک مرتبہ نبی منوالے تو اب وہ ماننے والے کے لئے امام معصوم بھی ہو گیا، واجب الاطاعت بھی ہو گیا، اس کی رائے سے اختلاف اور اس کے حکم سے انحراف کفر ہو جائے گا حتیٰ کہ اس کے خلاف دل میں کدورت کے جذبات رکھنا بھی کفر ہو جائے گا۔ پس ایسے شخص کے گرد جو تنظیم بنے گی اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایسی تنظیم کے علاوہ جو دوسری تنظیمیں ہوں گی ان کے صدر سے، امیر سے، سربراہ سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں، آپ ان کے خلاف سوءِ ظن میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں۔ ان کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے پیش بھی کر سکتے ہیں اور اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں چونکہ یہاں معاملہ ایمان و کفر کا نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس جہاں کسی کو نبی مان لیا گیا ہو وہاں ان تمام امکانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ اس برّصغیر میں قادیانیوں کی تنظیم سے بہتر اور مضبوط کوئی تنظیم نہیں ہے اور اس کا سبب یہی "نبوت" کا تصور ہے۔ یہ فائدہ نبوت کے دعویٰ کے بغیر حاصل ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔

پھر انہوں نے نبوت کے لازمی اور منطقی نتیجہ کو خود ہی لوگوں کے سامنے واضح کر کے پیش کر دیا۔ عامۃ المسلمین سے ان کی مساجد علیحدہ، نمازیں علیحدہ یہاں تک کہ وہ ہمارے جنازے میں شرکت نہیں کریں گے۔[1] حد یہ ہے کہ وہ ہمارے بچوں کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوں

[1] مشہور ہے کہ چودھری سر ظفر اللہ خاں صاحب نے جو لیاقت علی خاں مرحوم کی کابینہ میں اس وقت وزیر امور خارجہ تھے، اپنے محسن اور مربی اور بانیٔ پاکستان محمد علی جناح مرحوم کے نماز جنازہ میں شرکت نہیں کی تھی۔

گے۔ یہ بات باقاعدہ سوال و جواب کی صورت میں ان کے لٹریچر میں موجود ہے مرزا بشیر الدین محمود سے پوچھا گیا کہ بچے تو معصوم ہوتے ہیں لہذا اگر غیر احمدی بچوں کے جنازہ کی نماز میں شرکت کر لی جائے تو کیا حرج ہے؟ جواب دیا گیا کہ کیا آپ عیسائیوں کے بچوں کے نماز جنازہ میں شرکت کر سکتے ہیں؟ اسی طرح انہوں نے کسی غیر احمدی لڑکے سے احمدی لڑکی کا نکاح ناجائز اور غیر احمدی کی لڑکی سے احمدی کا نکاح جائز قرار دیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ اہل کتاب کی لڑکیوں سے نکاح جائز لیکن ان کو لڑکی دینا ناجائز ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس معاملہ کو منطقی انتہا تک تو قادیانی خود پہنچائیں اس کے جملہ مضمرات کو کھول کر وہ خود واضح کریں اور اس کے بعد اس کا جو عملی نتیجہ نکلنا چاہیئے یعنی یہ کہ ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو یہ اس پر واویلا کریں۔ اس میں آخر کیا معقولیت ہے؟ خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اعتقادی طور پر وہ اپنے آپ کو خود ہی ایک علیحدہ امت قرار دے چکے ہیں لیکن وہ اس کے مقدرات کو اس لئے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ اس طرح ان کے توسیع پسند عزائم میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ امت مسلمہ میں شامل رہ کر وہ جس طرح ہر قسم کے مادی فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں اس میں خلل واقع ہوتا ہے۔ غیر مسلم اقلیت ہونے کے باعث وہ حکومت کے تمام کلیدی مناصب سے محروم کر دیئے جائیں گے۔ نیز حکومت کے دفاتر اور محکمہ جات کی ملازمتوں میں تناسب تعداد کے لحاظ سے ان کا کوٹا مقرر ہو جائے گا۔ تبلیغ اسلام کے نام سے جو زرمبادلہ کثیر مقدار میں وہ ہر سال حاصل کرتے ہیں اس پر قدغن لگ جائے گی۔ مسلمانوں میں شامل رہنے کے سبب سے فوج، سفارت خانوں اور دیگر محکموں کے اعلیٰ عہدوں تک ان کی جو پہنچ اور دسترس حاصل ہے اس پر پابندی عاید ہو جائے گی۔ یہ نقصانات وہ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتے وہ چاہتے ہیں کہ آکاش بیل کی طرح شجر ملت سے لپٹے رہیں تاکہ اسی سے غذا حاصل کرتے رہیں اور اسی کی بربادی کے باعث ہوں۔ اسی لئے وہ واویلا مچا رہے ہیں اور خود کو "مسلمان" ثابت کرنے کے لئے اپنے روایتی دجل و فریب سے کام لے رہے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے خود اپنے اختیار کردہ مؤقف کے اعتبار سے اپنے علاوہ بقیہ تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر بحیثیت ایک جداگانہ امت اپنا تشخص تین چوتھائی صدی قبل ہی کر لیا تھا۔ ان حالات کی بنا پر ہر معقول اور انصاف پسند شخص اس نتیجہ پر بہ ادنیٰ تامّل پہنچ جاتا ہے کہ قادیانیوں کو ایک جداگانہ غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ انتہائی نرم، معقول اور بلکہ نیز ان کے حق میں مفید فیصلہ ہے۔ اور

اس طرح ان کو بین الاقوامی سطح پر MINORITY COMMUNITY کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر یہاں فی الواقع دینی نظام نافذ ہوتا تو ان پر جو کچھ بیتتی اور ان کو نئی نبوت کے اجرا اور اس کو ماننے کے جو نتائج بھگتنے پڑتے وہ ان کے لئے کہیں زیادہ سخت ہوتے۔ یہ تو لادینیت کا دور ہے اور ملک میں ابھی تک بالفعل انگریزی دور کا نظام معمولی حک و اضافہ کے ساتھ نافذ ہے اسی لئے ان کے ساتھ انتہائی نرم سلوک کا مطالبہ ہے ورنہ ان کے ساتھ معاملہ وہ ہوتا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کے زمانے میں ہوا اور خلافت راشدہ کے بعد بھی اسلامی سلطنت میں ارتداد کی جو سزائیں دی جاتی رہیں ان کا ان سزاؤں سے واسطہ پڑتا۔ یہ تو اکبر الہ آبادی مرحوم کے بقول اس دور کی برکت ہے کہ "انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ!"۔ کتنے ہی لغو اور مضحکہ خیز دعاوی کئے گئے۔ حتیٰ کہ نبوت کے قلعے میں بھی رخنہ ڈال دیا گیا اور نئی نبوت کے ٹھاٹھ بالفعل جما دیئے گئے۔ اپنے علاوہ عالم اسلام کے تمام مسلمانوں کو کافر دے دیا، ان کے بچوں کی بھی تکفیر کر ڈالی لیکن نہ صرف یہ کہ ان کا کچھ نہ بگڑ سکا بلکہ وہ مسلمانوں میں شامل رہ کر تمام حقوق سے استفادہ کرتے رہے اور اپنے خالص سازشی کردار اور "انجمن امداد باہمی" کے طرز پر کام کرتے ہوئے اپنے جائز حقوق سے کہیں بڑھ کر سہولتیں اور مراعات حاصل کیں بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ نرم ترین اور انتہائی وسعت قلبی کا سلوک ہے جو امت مسلمہ ان کے ساتھ روا رکھنا چاہتی ہے یعنی یہ کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر ان کے حقوق و فرائض متعین کر دیئے جائیں اور ان کو ہمیشہ کے لئے جسد ملت اسلامی سے علیحدہ کر دیا جائے۔"

(۲)

ہمارے نزدیک قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کا یہ فیصلہ ان 'معجزات' کے سلسلے کی تازہ ترین اور اہم ترین کڑی ہے جن کی بنا پر ہمیں یہ یقین حاصل ہے کہ پاکستان کا قیام اسلام کے احیاء اور دین حق کے اس عالمی غلبے کی خدائی اسکیم کا ایک اہم جزو ہے جس کی خبر مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔

کون نہیں جانتا کہ ۱۹۴۷ء یا اس کے لگ بھگ کا زمانہ تو دور رہا، آج تک بھی ہم قومی بیداری اور تعمیر نو کے اعتبار سے ہندوؤں کے پاسنگ تک کی حیثیت نہیں رکھتے اور کسے معلوم نہیں کہ اتحاد و تنظیم کا معاملہ ہو یا تعلیم و ترقی کا، پھر ایثار و قربانی کا معاملہ ہو یا محنت و مشقت کا، کسی بھی اعتبار سے برصغیر کے مسلمان ہرگز اس قابل نہ تھے کہ ہندوؤں کا مقابلہ کر سکتے اور ان کی خواہشات کے علی الرغم

'بھارت ماتا' کے ٹکڑے کرا لینے میں کامیاب ہو جاتے۔ گویا پاکستان کا قیام اسبابِ عادیہ کے اعتبار سے یقیناً خرقِ عادت کی قبیل سے تعلق رکھتا ہے اور احوالِ ظاہری کے اعتبار سے اسے ایک 'معجزہ' قرار دیئے بغیر چارہ نہیں۔ غور فرمایئے کہ:

۱۔ ۱۹۳۰ء سے پہلے تو کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ کل سترہ سال بعد برصغیر کے شمال مشرقی اور شمال مغربی علاقوں پر مشتمل کالعدم ایک آزاد اور خود مختار مسلمان مملکت قائم ہو سکتی ہے۔ پہلی بار ۱۹۳۰ء میں، اپنے مشہور خطبۂ صدارت (الٰہ آباد) میں علامہ اقبال مرحوم نے اس کا دھندلا سا تصور پیش کیا لیکن وہ بھی 'زیادہ سے زیادہ'، جو کچھ کہہ سکے وہ یہ تھا کہ ہندوستان کے 'کم از کم' شمال مغربی صوبوں پر مشتمل ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہونی چاہیئے۔ گویا کہ موجود الوقت حالات کے پیشِ نظر مشرقی علاقوں کا تو نام تک زبان پر لانے کی جرأت 'لسان القوم' کو نہ ہو سکی، پھر کون نہیں جانتا کہ اس وقت اس ادھورے تصور کو بھی ایک مجذوب کی بڑ اور ایک قلندر کے نعرۂ مستانہ سے زیادہ حیثیت حاصل نہ تھی۔

۲۔ پھر ۱۹۴۰ء میں مشہور 'قرار دادِ پاکستان' منظور ہوئی تو اس میں بھی ہندوستان کے شمال مشرق اور شمال مغرب میں "مسلم ریاستوں" کا تصور پیش کیا گیا اس لئے کہ اس وقت تک یہ بات ناممکن التصور تھی کہ ان دونوں پر مشتمل 'ایک ریاست' بھی قائم ہو سکتی ہے ——— پھر کسے معلوم نہیں کہ اس 'قرار داد لاہور' کی حیثیت بھی اصلاً دو فریقوں کے مابین کسی تصفیہ طلب معاملے میں سودے بازی کے مروجہ طریقے پر ایک فریق کی جانب سے ابتداءً اونچے سے اونچے مطالبے کی تھی جس کے تسلیم کئے جانے کا کوئی امکان خود مطالبہ کرنے والے کے ذہن میں بھی نہیں ہوتا۔

۳۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن پلان کو فوراً منظور کر لیا جس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہ ایک آزاد مسلم ریاست کے مطالبے سے کم از کم وقتی طور پر تو دستبردار ہو ہی گئی تھی، اب اسے خالص خدائی تدبیر کے سوا اور کیا سمجھا جائے کہ عین اس وقت آنجہانی پنڈت نہرو کی 'مت ماری گئی' اور ان کی ایک ہمالیہ ایسی حماقت کے نتیجے میں پاکستان ایک آزاد اور خود مختار مسلم ریاست کی حیثیت سے منصۂ شہود پر آ گیا۔ گویا اس عالمِ اسباب و علل میں پاکستان کے ایک کلیتہً آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے قیام کے لئے ہم اصلاً پنڈت جی کے ممنونِ احسان ہیں۔

۴۔ اس پر مستزاد یہ کہ پاکستان کے قیام کا فیصلہ اس وقت ہوا جب انگلستان میں لیبر پارٹی برسرِ اقتدار تھی جو نہ صرف یہ کہ کبھی بھی مسلمانوں کی ہمدرد یا طرفدار نہ رہی تھی بلکہ ہمیشہ سے کانگرس کی ہمنوا اور ہم خیال رہی تھی، خصوصاً اس وقت کے برطانوی وزیر اعظم مسٹر ایٹلے کو جو بعض مسلم لیگ اور اس کے

سربراہ و قائد محمد علی جناح مرحوم کے ساتھ تھا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

ان حقائق کی روشنی میں غور کیجئے تو کیا پاکستان کا قیام کسی حساب کتاب میں آنے والا معاملہ نظر آتا ہے؟ اور کیا اس میں کوئی مبالغہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان ایک خالص خدائی تدبیر کے طور پر قائم ہوا اور اس کے قیام کا فیصلہ زمین پہ نہیں آسمان پہ ہوا[1] اور گویا اسے مسلمانان ہند نے قائم نہیں کیا بلکہ یہ ان پر 'اوپر' سے ٹھونسا گیا۔

مزید غور فرمائیے کہ ۱۹۶۲ء میں سابق صدر ایوب خان مرحوم نے" جبکہ وہ پاکستان میں ہر اعتبار سے 'کوس لمن الملک' بجا رہے تھے اور گویا پورے پاکستان کے سیاہ و سفید کے تنہا مالک و مختار تھے، امریکی دباؤ کے تحت بھارت کو 'مشترکہ دفاع' کی پیش کش کی! اب ظاہر ہے کہ مشترکہ دفاع کا لازمی مطلب مشترک خارجہ پالیسی بھی ہے اور چونکہ آجکل بجٹ کا اکثر حصہ دفاعی اخراجات ہی پر صرف ہوتا ہے لہذا اس کا لازمی نتیجہ مشترک بجٹ بھی ہے تو کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ اس وقت پاکستان کے ذمہ دار ترین شخص نے پاکستان کی آزادی اور خود اختیاری کو چاندی کی طشتری میں رکھ کر بھارت کی خدمت میں پیش کر دیا تھا؟ اور اگر صدر ایوب مرحوم کو ملت اسلامیہ پاکستان کا ترجمان قرار دیا جائے تو کیا اس سے یہ مطلب نکالنا غلط ہوگا کہ ملت اسلامیہ پاکستان نے گویا دوبارہ ایک کلیتہً علیحدہ اور خود مختار پاکستان سے دستبرداری اختیار کرتے ہوئے پھر کیبنٹ مشن پلان ہی کی جانب رجعت اختیار کر لی تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ پھر اسی 'خدائی تدبیر' کا ظہور ہوا اور دوبارہ ان ہی پنڈت نہرو کی 'عقل ماری گئی' اور انہوں نے اس پیش کش کو نہایت حقارت کے ساتھ ٹھکرا کر گویا پاکستان کی آزادی اور خود اختیاری کی از سر نو توثیق کر دی۔

تو کیا کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے اس میں کہ پاکستان کا ایک آزاد اور خود مختار ملک کی حیثیت سے برقرار رہنا بھی ہماری کوشش سے نہیں بلکہ خالص

---

[1] مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے قریبی حلقوں میں یہ روایت عام بیان ہوتی ہے کہ ۱۹۴۶ء کے رمضان المبارک کے دوران میں جب مولانا قدس سرہٗ اپنے معمول کے مطابق سلہٹ میں مقیم تھے انہوں نے کشف کی بنیاد پر اپنے رفقاء کو بتا دیا تھا کہ "ملاءِ اعلیٰ میں پاکستان کے قیام کا فیصلہ ہو چکا ہے!"

خدا کی فیصلے کے تحت ہے جو اُوپر سے مسلّط ہوتا ہے (یُدَبِّرُ الاَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ)[1]

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران پھر اس امر کے ناقابل تردید شواہد ملے کہ پاکستان کا بقا آسمان والے ہی کو مطلوب ہے ورنہ جس طرح بھارتی افواج حملہ آور ہوئی تھیں اور واہگہ کی سرحد عبور کر کے بلا روک ٹوک لاہور کی جانب بڑھ رہی تھیں، واقعہ یہ ہے کہ اس عالم اسباب کے اعتبار سے تو 'سقوط لاہور' طے شدہ ہی تھا، یہی وجہ ہے کہ بی بی سی سے اس کی 'خبر' بھی نشر ہو گئی۔ اب یہ 'معجزہ' نہیں تو اور کیا ہے کہ بھارتی افواج ہی کے دلوں میں وسوسہ پیدا ہوا اور انہیں یہ خوف لاحق ہو گیا کہ کہیں ہمیں کسی خوفناک گھیرے میں تو نہیں لیا جا رہا؟ چنانچہ وہ ٹھٹک کر رک گئیں اور اسی شش و پنج میں وقت گزر گیا اور شام کو لاہور جیمخانہ میں دادِ عیش دینے کے سارے منصوبے دھرے رہ گئے۔ غور کا مقام ہے کہ کیا یہ "سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ کَفَرُوا الرُّعْبَ"[2] کی بیّن مثال نہیں اور کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ پاکستان کا قیام اور بقا اللہ تعالیٰ کی کسی طویل المیعاد سکیم کی اہم کڑی ہے؟

یہ ٹھیک ہے کہ ۱۹۷۱ء میں ہمیں اپنے کرتوتوں کی سزا بھی ملی۔ اور "لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ"[3] کے اٹل قانون کے تحت اللہ تعالیٰ کے احسانات کی ناقدری پر عذاب شدید کا ایک کوڑا بھی ہماری پیٹھ پر پڑا۔ لیکن غور کا مقام ہے کہ ـــــ ایک طرف تو اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے ہم سے صرف وہ چیز چھینی جو 'نعمت و فضل خداوندی' کے حکم میں تھی جس کا تصوّر تک بھی ہم ۱۹۲۶ء سے قبل نہ کر سکتے تھے چنانچہ ۱۹۳۰ء میں تو اس کا ذکر تک بھی زبان پر نہ لا سکے اور ۱۹۴۰ء میں ذکر کیا بھی تو ایک علیحدہ ریاست کی حیثیت

---

[1] سورۃ سجدہ آیت ۵ "تدبیر فرماتا ہے وہ اپنے 'امر' کی آسمان سے زمین کی طرف!"

[2] سورۃ انفال آیت ۱۲ "عنقریب میں ڈال دوں گا اہل کفر کے دل میں دہشت اور خوف!"

[3] سورۃ ابراہیم آیت ۷ "اور جبکہ پوری طرح واضح کر دیا تمہارے رب نے کہ اگر تم (میرے احسانات کی) قدر کرو گے تو میں مزید دوں گا تمہیں اور اگر تم ناقدری کے مرتکب ہوئے تو (جان لو کہ) میری سزا بھی بڑی سخت ہے!"

سے —— اور دوسری طرف واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر بھی مغربی پاکستان کا تحفظ اللہ تعالیٰ نے خالص معجزانہ طریق پر کیا۔ کوئی حقائق و واقعات سے بالکل ہی صرفِ نظر کر لے تو دوسری بات ہے ورنہ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ اگر سابق صدر نکسن نے روسی وزیر اعظم مسٹر کوسیگن کو واضح الٹی میٹم دے دیا ہوتا اور آسمانِ ماسکو سے نازل شدہ "وحی" کی پیروی میں مسز اندرا گاندھی نے جنگ بندی کا "یک طرفہ" اعلان نہ کر دیا ہوتا تو جس طرح ہمارے حوصلے پست ہو چکے تھے اور سوا ایک سیکٹر کے پورے کے پورے محاذ پر بھی ہمارا دفاع بالکل مجروح اور شکستہ (SHATTER) ہو چکا تھا، رہی ایر فورس اور نیوی تو وہ دونوں تو گویا بالکل ہی مفلوج بلکہ معدوم کے حکم میں آ چکی تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قوم کو سرے سے کوئی قیادت حاصل ہی نہ تھی —— اور ادھر بھارت کا حوصلہ (MORALE) آسمان سے باتیں کر رہا تھا اور سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد اب وہ بالکل یکسو ہو کر اپنی ساری جنگی قوت کا رُخ مغربی پاکستان کی جانب پھیر سکتا تھا اور اسبابِ ظاہری کے اعتبار سے حقیقت یہ ہے کہ مغربی پاکستان بھارت کے لئے چند دن کی مار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا تھا۔

اب ذرا غور کیجئے کہ اگر "خدانخواستہ" اس وقت سابق صدر نکسن یہ چند دن گومگو اور تذبذب کے عالم اور INDECISION کی کیفیت میں گزار دیتے —— اور امریکی رائے عامہ اور کانگریس کے غالب رجحان کے پیشِ نظر یہ صورت ہرگز بعید از امکان نہیں بلکہ عین قرینِ قیاس تھی تو کیا ہوتا؟ اب جن کور باطنوں کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ انسانوں کے دل "بَیْنَ اِصْبَعَیِ الرَّحْمٰنِ"[1] ہیں اور وہ ان کو جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے ان کا معاملہ تو دوسرا ہے لیکن جن کی باطن کی آنکھ بھی کسی قدر کھلی ہوئی ہو انہیں تو اس پورے معاملے میں تدبیرِ الٰہی ہی کارفرما نظر آتی ہے اور "وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ"[2] ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے —— !!

مذکورہ بالا تمام شواہد کا مفاد تو اسی قدر ہے کہ پاکستان کا قیام بھی ایک "معجزہ" تھا اس کا

۱؎ ایک حدیث کے الفاظ "انسانوں کے دل اللہ کی دو انگلیوں کے مابین ہیں وہ ان کا رُخ جدھر چاہتا ہے پھیر دیتا ہے"

۲؎ سورۃ یوسف آیت ۲۱ "اللہ اپنے فیصلے (کی تنفیذ) پر پوری طرح قادر ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے (کماحقہ) واقف نہیں ہیں"

تک جھک ایک ربع صدی تک اپنی کامل حالت میں برقرار رہ جانا بھی ایک 'معجزہ' تھا اور اب اس مغربی پاکستان کا بچ جانا بھی، جسے عام طور پر ناقدری میں 'بچا کھچا پاکستان' کہہ دیا جاتا ہے، ایک 'معجزہ' ہی ہے لیکن قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے تاریخی فیصلے کی صورت میں جو تازہ ترین 'معجزہ' ظاہر ہوا ہے اس نے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس ملک کا نہایت گہرا تعلق دین و مذہب کے ساتھ ہے اور دستِ قدرت نے اسلام اور پاکستان کے مابین ایک ایسے مضبوط رشتے کی گرہ باندھ دی ہے جسے کھولنا کسی کے لئے ممکن نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اگر پاکستان کے وجود میں آنے کا پورا عمل (GENESIS) اور اس کی ستائیس سالہ تاریخ کے دوران میں ظاہر ہونے والے وہ شواہد بھی پیش نظر رہیں جن کا اجمالی تذکرہ اوپر ہوا تو اس نتیجے تک پہنچنے میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی کہ درحقیقت پاکستان کا قیام اور بقا احیائے اسلام اور غلبۂ دینِ حق کے ایک طویل المیعاد[1] خدائی منصوبے کا اہم جزو ہے۔

> اس لئے کہ بیسویں صدی عیسوی کے اس ربع آخر کے قریب، جبکہ پورے کرۂ ارضی پر الحاد کا کامل تسلط ہے اور پورے عالم انسانی میں لادینیت کا دور دورہ ہے نتیجۃً 'ریاست' اور 'مذہب' دو بالکل جدا اور ایک دوسرے سے کلیتہً آزاد اداروں کی حیثیت رکھتے ہیں پھر اس وقت جبکہ پاکستان میں وہ قیادت برسرِ اقتدار ہے جس کا دین و مذہب سے عملی تعلق تو اظہر من الشمس ہے ہی، اس کے اپنے مبینہ موقف کے اعتبار سے بھی اسلام کو اس کے PARTY CREED میں 'تینوں میں کے ایک' سے زیادہ کی حیثیت حاصل نہیں۔ ایک گروہ کی حیثیت کا تعین خالص مذہبی بنیادوں پر ہونا اس کے بغیر ہرگز ممکن نہیں کہ کوئی خاص خدائی تدبیر کار فرما ہو اور قدرت کا کوئی عظیم منصوبہ ہی اس سے وابستہ ہو۔

ہمارے نزدیک اس کی واحد توجیہہ یہ ہے کہ دراصل پاکستان کو اس وسیع اور ہمہ جہتی احیائی عمل میں ایک اہم مقام حاصل ہے جو اس صدی کے ربع اوّل کے بعد سے اس وقت شروع ہوا جب

[1] یہ 'طویل المیعاد' بھی دراصل صرف ہماری تقویم کے اعتبار سے ہے ورنہ خدائی تقویم کے حساب سے تو معاملہ وہ ہے جو آیۂ قرآنی "اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا" (سورہ معارج ۶ : ۷) میں بیان ہوا۔

اُمّتِ مسلمہ کا زوال و انحطاط انتہا کو پہنچ گیا اور قانونِ قدرت کے عین مطابق "جذر" کی انتہا کے بعد حالات کا رُخ "مدّ" کی جانب مُڑ گیا۔

(۳)

"وسیع اور ہمہ جہتی احیائی عمل" کا ذکر آ ہی گیا ہے تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے بارے میں اپنے خیالات قدرے تفصیل سے پیش کر دیں۔ اس لئے کہ ایک تو اس کا گہرا تعلق ہماری موجودہ سرگرمیوں اور آئندہ کے لائحہ عمل سے ہے اور یہ چیز بیں آج کل 'میثاق' میں تفصیلاً زیرِ بحث آ رہی ہیں اور دوسرے ممکن ہے کہ اس سے ہمارا موقف ان لوگوں پر واضح ہو سکے جن کی ہم سے ناراضگی اور دل گرفتگی کا واحد سبب یہ ہے کہ وہ ذہنی طور پر اشخاص یا جماعتوں کے تنگ دائرے سے باہر نکلنے کو تیار نہیں ہیں اور تمام معاملات پر کسی متعیّن شخصیت یا کسی مخصوص جماعت کے محدود زاویۂ نگاہ ہی سے غور کرتے ہیں اور کیا عجب کہ اس سے اس عمومی صورتِ حال کی شدّت میں بھی کچھ کمی ہو سکے کہ مخصوص شخصی یا جماعتی وابستگی کے باعث اکثر لوگوں کا افقِ ذہنی بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ نتیجۃً ایک محدود دائرے کے اندر اندر تو شدید محبّت بلکہ اندھی عقیدت کی حکمرانی ہوتی ہے اور اس سے باہر کے لئے ان کے پاس نفرت اور خدا واسطے کی عداوت کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ چنانچہ تعصّب کی ایک بھاری پٹی ان کی آنکھوں پہ بندھ جاتی ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ ایک جانب کا تو بڑے سے بڑا شر بھی انہیں خیر نظر آنے لگتا ہے اور دوسری طرف کے بڑے سے بڑے خیر میں بھی وہ کوئی نہ کوئی پہلو شر کا ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ گویا ایک جانب انہیں 'خیرِ کلّ' کا مشاہدہ ہوتا ہے اور دوسری طرف 'شرِّ محض' کا!

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، ہمارے نزدیک بیسویں صدی عیسوی کو اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ (TURNING POINT) کی حیثیت حاصل ہے، چنانچہ اس کے ربعِ اوّل کے خاتمے کے لگ بھگ جبکہ اُمّت کے ایک حسّاس اور دردمند فرد کی دل کی گہرائیوں سے یہ درد انگیز صدا بلند ہوئی ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!! (حالی)

تاریخ ایک کروٹ لے چکی تھی اور ملّتِ اسلامی کے تنِ مُردہ میں حیاتِ تازہ کے کچھ آثار ظاہر ہونے شروع ہو چکے تھے۔

اور اگر ذرا بنظر غائر مشاہدہ کیا جائے تو اس صدی کا درمیانی نصف تو ایک نہایت ہی عجیب نقشہ پیش کرتا ہے۔ یعنی یہ کہ ایک طرف تنزل اور انحطاط کا عمل بھی جاری رہا اور نکبت و ادبار کے سائے مزید گہرے ہوتے چلے گئے جس کا نقطۂ عروج (CLIMAX) ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۱ء کی ذلت و رسوائی ہے اور دوسری طرف ایک گھمبیر اور ہمہ جہتی احیائی عمل کا آغاز بھی ہو گیا جس کا نقطۂ آغاز ۱۹۲۵ء کا زمانہ ہے۔ گویا مسلسل پچاس برس تک یہ دونوں عمل "مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝" کی سی شان کے ساتھ پہلو بہ پہلو جاری رہے۔

اس اجمال کی تفصیل کے ضمن میں ہم پہلے امتِ مسلمہ کے عروج و زوال کا ایک اجمالی خاکہ تاریخی ترتیب (CHRONOLOGICAL ORDER) کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ ایک طرف عروج کے ضمن میں ملتِ اسلامی کی عظمت و سطوت گزشتہ کی ایک جھلک سامنے آئے اور علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ ؎

"کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟ وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!"

مسلمان نوجوان کو معلوم ہو کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب عرب افواج جبرالٹر سے شمال مشرق کی جانب بڑھتی ہوئی فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب ترک افواج پورے مشرقی یورپ کو روندتی ہوئی آسٹریا کے دروازوں تک جا پہنچی تھیں، شاید کہ اسی طرح کچھ نوجوانوں کے دل میں ملتِ اسلامی کی تجدید اور اس کی عظمت و سطوتِ گزشتہ کی بازیافت کا جذبہ پیدا ہو جائے" ——— اور دوسری طرف "زوال" کے ضمن میں یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ خدا کا عدل بے لاگ ہے اور اس کا قانون اٹل اور غیر مبدّل، اس نے جو معاملہ سابق امتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ کیا بعینہٖ وہی ہمارے ساتھ کیا۔ حتیٰ کہ ہماری اور ان کی تاریخ میں ایسا حد درجہ حیرت انگیز مشابہت موجود ہے۔ اس پہلو سے کہ یہود پہ بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دو دور آئے اور ہم پہ بھی دو ہی دور آئے۔ اگرچہ امتِ محمدؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی وسعت کی نسبت سے ہمارے نکبت و ادبار کے یہ دور بھی یہود کے مقابلے میں بہت طویل رہے اور جس طرح بنی اسرائیل

لہ سورۂ رحمٰن، آیات ۱۹ و ۲۰ "چلائے دو دریا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ (لیکن) دونوں کے مابین ایک پردہ (حائل) ہے کہ باہم ایک دوسرے پر غالب نہ آسکیں!"

کی تولیت کے زمانے میں بیت المقدس کے ناموس کا پردہ ہے

"اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک!"

کے مصداق دو بار چاک ہوا اسی طرح ہمارے عہدِ تولیت میں بھی مسجد اقصیٰ کی حرمت دو ہی مرتبہ پامال ہوئی۔

اس کے بعد ہم اس گھمبیر اور پیچیدہ "احیائی عمل" کا اجمالاً جائزہ لیں گے تاکہ ایک طرف لوگوں کا افقِ ذہنی وسیع ہو اور وہ مختلف احیائی کوششوں کو ان کے صحیح پس منظر (PERSPECTIVE) میں دیکھ سکیں اور دوسری طرف یہ بھی واضح ہو جائے کہ ہم خود اس ہمہ جہتی احیائی عمل کے کس گوشے میں ایک حقیر سی خدمت سرانجام دینے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ "لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ"[1] کے مصداق جو ہمارا ساتھ دینا چاہے وہ بھی پورے انشراحِ صدر کے ساتھ دے اور جو تنقید کی "خدمت" سرانجام دینا چاہے وہ بھی ہمارے موقف کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد اس اہم اگر نازک فرض کی ادائیگی پر کمربستہ ہو!

اُمتِ مسلمہ کے عروج و زوال کے تاریخی خاکے کے ضمن میں دو باتیں پیشگی سمجھ لینی چاہئیں:

ایک یہ کہ اپنی ہیئتِ تشکیلی کے اعتبار سے اُمتِ محمدؐ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دو حصے ہیں۔ پہلا "اُمّیّین" یعنی بنی اسمٰعیل پر مشتمل ہے اور اسے اس امت کے قلب یا مرکز (NUCLEUS) کی حیثیت حاصل ہے اور دوسرا "آخرین" یعنی دیگر اقوام پر مشتمل ہے خواہ وہ کرد ہوں یا ترک، اہلِ فارس ہوں یا اہلِ ہند، افغان ہوں یا مغل، اہلِ حبش ہوں یا بربر، مشرقِ بعید یعنی ملایا اور انڈونیشیا سے تعلق رکھتے ہوں یا مغربِ بعید یعنی مراکو، مورطانیہ سے۔

دوسرے یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے بھی عالمِ اسلام کو تین حصوں میں منقسم سمجھنا چاہیئے یعنی ایک قلب، دوسرے میمنہ اور تیسرے میسرہ، اگر دنیا کے نقشے کو سامنے رکھ کر عالمِ اسلام پر نگاہ جمائی جائے تو وہ ایک ایسے عقاب کے مانند نظر آئے گا جو اپنے دونوں بازوؤں کو پوری طرح پھیلائے محوِ پرواز ہو۔ جزیرہ نمائے عرب، عراق، فلسطین، شام اور ایشیائے کوچک جو عالمِ اسلام کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں اس عقاب کے جسم کے مانند نظر آئیں گے جن میں سے ایشیائے کوچک کو اس کے سر

---

[1] سورۂ انفال آیت ۴۲: "تاکہ ہلاک ہو جسے ہلاک ہونا ہے حجت قائم ہو چکنے کے بعد اور جسے جینا ہو واضح دلیل کے ساتھ!"

اور چونچ سے مشابہت ہے اور جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصّے کو اس کے دم کے پھیلے ہوئے پر دونوں سے اس عقاب کا دایاں بازو (میمنہ) ایران، ترکستان، افغانستان اور برّصغیر ہند و پاک سے ہوتا ہوا ملایا اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے اور بایاں بازو (میسرہ) پورے شمالی افریقہ کو لپیٹ میں لیتا ہوا اسپین تک چلا گیا ہے۔

اب آئیے تاریخی خاکے کی طرف:

سن عیسوی[۱] کے حساب سے اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ کا آغاز ساتویں صدی سے ہوتا ہے اس لئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت تقریباً ۵۷۱ء میں ہوئی، ۶۱۱ء میں آپ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا اور محتاط ترین حساب کے مطابق اپریل ۶۳۲ء میں آپ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک "اسلامی انقلاب" کی تکمیل فرما کر "رفیقِ اعلیٰ" سے جا ملے، فصلی اللہ علیہ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً۔ اصحابِ ثلاثہ یعنی حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے عہد خلافت کے دوران "اُمیّین" ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار لئے ہوئے ایک سیلاب کے مانند جزیرہ نمائے عرب سے نکلے اور انہوں نے ایک ربع صدی سے بھی کم میں ایران و عراق، شام و فلسطین اور مصر کے علاوہ شمالی افریقہ کے بڑے رقبے پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، کے عہد خلافت میں تو یہ عمل رکا رہا لیکن بنو امیہ کے دور کے آغاز کے ساتھ ہی اس سیلاب نے دوبارہ آگے بڑھنا شروع کر دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک طرف مشرق میں ترکستان، افغانستان اور سندھ تک اور دوسری طرف مغرب میں پورے شمالی افریقہ کے علاوہ سپین سمیت مغربی یورپ کا وسیع علاقہ "اُمیّین" کے زیرنگیں آ گیا اور عالم اسلام کی سرحدیں تین برّاعظموں تک وسیع ہو گئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب عرب افواج اندلس سے پیش قدمی کرتے ہوئے فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں۔

آٹھویں، نویں اور دسویں صدی عیسوی کا زمانہ عربوں کے عروج کا دور ہے، جس کے دوران اسلام کی علمبرداری اور عالم اسلام کی سیادت دونوں "اُمیّین" کی دو اہم شاخوں یعنی بنو امیہ اور بنو عباس کے پاس رہیں[۲] اور روئے ارضی کے ایک بڑے حصّے پر ان کے دین و مذہب، ان کے

---

[۱] چونکہ اکثر لوگوں کے اذہان سن عیسوی ہی کے ساتھ زیادہ مانوس ہیں، لہٰذا یہاں اسی کو پیشِ نظر رکھا جا رہا ہے!

[۲] حاشیہ اگلے صفحہ پر

تہذیب و تمدن، ان کے علوم و فنون اور ان کی شان و شوکت کا سکہ رواں رہا۔ لیکن جیسے جیسے دنیوی جاہ و جلال میں اضافہ ہوا، جذباتِ دینی اور حرارتِ ایمانی میں کمی آتی چلی گئی اور اس طرح یہ تناور درخت اندر سے کھوکھلا ہوتا چلا گیا۔ اس اندرونی اضمحلال کے اثرات کے ظاہر ہونے میں کچھ مدت ضرور صرف ہوئی لیکن دسویں صدی عیسوی ہی کے دوران واضح ہو گیا تھا کہ عرب اپنے عالمِ پیری میں قدم رکھ چکے ہیں۔

گیارھویں صدی عیسوی کے دوران میں 'اُمّیّیّن' کا انحطاط اور زوال اپنی آخری حدود کو پہنچ گیا اور اس طرح عالمِ اسلام کے قلب میں قوت کا ایک خلا (POWER VACUUM) پیدا ہو گیا۔

خوش قسمتی سے قوت کے دباؤ میں اس کمی (DEPRESSION) کے نتیجے میں عالمِ اسلام کی شمال مشرقی سرحدوں سے جو قبائل قلبِ اسلام کی طرف کھنچ کر آئے وہ پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے۔ یعنی کُرد اور ترکانِ سلجوقی جنہوں نے گیارھویں صدی عیسوی کے دوران شام، فلسطین اور مصر میں مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے اور اس طرح عالمِ اسلام کے قلب کی حفاظت اور مدافعت کے لئے کسی قدر تازہ دم قوت فراہم ہو گئی۔[۱]

بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے دوران میں اُمّتِ مسلمہ پر گویا عذابِ خداوندی کے "وعدۂ اولیٰ" کا ظہور ہوا اور ہو بہو "بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ

(حاشیہ بقیہ صفحہ گزشتہ) [۲] ان میں سے بھی صرف بنو امیہ کے دورِ حکومت کو خالص عرب غلبہ و اقتدار کا دور قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ بنو عباس کے دورِ حکومت میں ابتدا ہی سے اہلِ عجم کو حکومت و سلطنت کے معاملات میں فیصلہ کن دخل حاصل ہو گیا تھا اور دراصل اسی نے عرب اقتدار کے تناور درخت کو اندر ہی اندر گھن کی طرح چٹ کر لیا ورنہ خالص عرب خون میں جو حرارت بھی اور قوتِ مقاومت موجود تھی اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ بنو امیہ کی ایک شاخ جس نے اندلس میں قدم جمائے وہ عالمِ اسلام کے قلب سے عرب قوت کے کلی خاتمے کے بھی تین صدی بعد تک پھلتی پھولتی رہی اور اس کا خاتمہ کہیں پندرھویں صدی عیسوی میں جا کر ہوا۔

[۱] یہ اسی دور کی بات ہے کہ افغان قبائل نے جنوب مشرق کا رُخ کیا اور ہندوستان پر حملے شروع کئے جس سے ہند میں مسلمانوں کی عظیم الشان مملکت کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔

شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ[1]" کا نقشہ کھینچ گیا۔ چنانچہ پہلے مغرب سے صلیبی طوفان کے ریلے آنے شروع ہوئے اور ۱۰۹۹ء میں نہ صرف یہ کہ مسجد اقصیٰ کے ناموس کا پردہ چاک ہوا بلکہ بیت المقدس میں وہ قتل عام ہوا جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مغربی مؤرخین بھی کانپ جاتے ہیں۔ پورے اٹھاسی برس تک بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ رہا اس لئے کہ دولت عباسی تو "مرنے والی امتوں کے عالم پیری" کا نقشہ پیش کر رہی تھی گویا 'اُمَیِّیْن' میں تو سرے سے دم خم باقی ہی نہ رہا تھا بالآخر 'آخَرِیْن' کے تازہ و گرم خون نے مجاہد کبیر صلاح الدین ایوبیؒ کی سرکردگی میں ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس کو صلیبیوں کے قبضے سے نجات دلائی، اور اس طوفان کا رُخ موڑا۔

——— اور پھر مشرق کی جانب سے آیا فتنۂ تاتار کا وہ طوفان عظیم جس نے پہلے افغانستان اور ایران کو پامال کیا اور ہر جگہ کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور بالآخر ۱۲۵۸ء میں بغداد میں وہ تباہی مچاتی کہ رہے نام اللہ کا۔ لاکھوں مسلمان تہ تیغ ہوئے۔ بغداد کی گلیاں خون کی ندیاں بن گئیں اور الف لیلہ کے اس کے رومانوی شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور بعینہٖ وہ کیفیت پیدا ہو گئی جو کم و بیش دو ہزار سال قبل بخت نصر کے ہاتھوں سے بیت المقدس کی ہوئی تھی۔ نتیجۃً زوال ملک مستعصم امیر المومنین کے ساتھ ہی خلافت عباسی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بالکل گل ہو گیا اور نہ صرف یہ کہ اُمّت مسلمہ پر عذاب خداوندی کا یہ پہلا دور تکمیل کو پہنچا بلکہ کم از کم 'اُمَیِّیْن' کی حد تک تو "اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ[2]" کی وعید بھی پوری ہو گئی اور وہ عالم اسلام کی سیادت و قیادت کے منصب سے معزول کر دیئے گئے۔ دو سال بعد یعنی ۱۲۶۰ء میں اس طوفان کا رُخ بھی 'آخَرِیْن' ہی نے پھیرا جس سے کم از کم اسلام کا مغربی بازو اس کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہ گیا۔

بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی کے دوران عالم اسلام کا قلب بعینہٖ وہی نقشہ پیش کر رہا تھا جسے دیکھ کر کبھی حضرت عزیر علیہ السلام کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ "اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا[3]!" لیکن پھر اُمّت مسلمہ کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی وہی شان ظاہر ہوئی جس کا

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل آیت ۵ "پھر جیسے ہم نے تم پر اپنے بندے سخت جنگجو جو گھس گئے اور پھیل گئے شہروں کے مابین!"

[2] سورۂ فتح آیت ۳۸: "اگر تم پیٹھ موڑ لو گے تو (اللہ) تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو کھڑا کر دے گا!"

[3] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۹: "کیسے زندہ کرے گا اللہ اسے، اس کی موت کے بعد!"

ظہور بنی اسرائیل کے حق میں ہوا تھا یعنی " ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنٰكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَجَعَلْنٰكُمْ أَكْثَرَ نَفِيْرًا ۝" [1] صرف اس فرق کے ساتھ کہ چونکہ سابقہ اُمّتِ مسلمہ ایک ہی نسل پر مشتمل تھی لہذا اس کی 'نشاۃ ثانیہ' کا یہ عمل بھی لامحالہ اسی نسل کے اندر واقع ہوا لیکن اُمّتِ محمدؐ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے معاملے میں یہ مجبوری نہ تھی لہذا یہاں 'تجدیدِ ملّت' کا یہ کام 'آخرین'[2] کی مختلف اقوام سے لے لیا گیا۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ خود انہی ترکان چنگیزی کا بڑا حصّہ اسلام لے آیا جن کے ہاتھوں عالمِ اسلام پر ہولناک تباہی آئی تھی بلکہ انہی کے قبیل کے وحشی قبائل میں سے دو قبیلوں کو یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے اور ان میں سے ایک یعنی ترکانِ تیموری نے ہندوستان میں ایک عظیم الشان مسلم سلطنت کی بنیاد رکھ کر عالمِ اسلام کے دائیں بازو کی توسیع کی اور دوسرے یعنی ترکانِ عثمانی نے ابتداءً ایشیائے کوچک میں قدم جماتے اور پھر رفتہ رفتہ اس عظیم الشان مسلمان مملکت کی بنیاد رکھی جس نے ایک طرف پورے مشرقی یورپ پر اپنی بالادستی کا سکّہ جمایا۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر اٹلی کے دروازوں تک پر دستک دی اور دوسری طرف شمالی افریقہ سمیت پورے عالمِ اسلام کے قلب کی حفاظت و سیادت کی ذمّہ داری سنبھالی تا آنکہ خلافت کا بھی احیاء کیا۔ اور اس طرح گویا عالمِ اسلام کے قلب کی عظمت و سطوتِ گزشتہ پھر پوری طرح لوٹ آئی۔ اگرچہ عربوں کے ذریعے نہیں بلکہ ترکوں کے واسطے سے!

قدرت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ اُدھر تو خلافتِ عثمانی کے استحکام کے ذریعے عالمِ اسلام کے قلب میں گویا ملّت کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور اُدھر یورپی استعمار کے سیلاب کی صورت میں امّتِ مسلمہ پر عذابِ الٰہی کے دوسرے اور نہایت طویل دور کا آغاز ہو گیا جس کا اصل زور عالمِ اسلام کے میسرہ اور میمنہ کی جانب رہا۔

یہ ایک ناقابلِ تردید تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ میں احیاء (RENAISSENCE) کا پورا عمل اسلام ہی کے زیرِ اثر شروع ہوا اور یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یورپ کو مشرق و مغرب کے علوم و فنون سے روشناس کرایا۔ لیکن جیسے ہی یورپ میں بیداری پیدا ہوئی اور وہاں قومیّت کا

---

[1] سورہ بنی اسرائیل آیت ۶: "پھر ہم نے تمہیں ان پر دوبارہ غلبہ عطا فرمایا اور تمہاری مدد کی مال و اسباب اور بیٹوں سے اور کر دی تمہاری نفری سب سے زیادہ!"

[2] ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے — پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے! (اقبالؒ)

دباؤ (POWER POTENTIAL) بڑھا گویا عالم اسلام کی شامت آگئی۔

یورپ مشرق و مغرب دونوں اطراف سے مسلمانوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا (LOCKED) تھا۔ لیکن مشرق میں عذاب کے وعدۂ اولیٰ کے بعد نشاۃ ثانیہ کا عمل ظاہر ہو چکا تھا اور عظیم سلطنت عثمانیہ عالم اسلام کے قلب کے محافظ سنتری کی حیثیت سے کھڑی تھی البتہ مغرب میں اب دولت ہسپانیہ "مرنے والی امتوں کے عالم پیری" کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ لہٰذا " ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات !" کے مصداق یورپی استعمار کا اوّلین شکار وہی بنی اور پندرھویں صدی عیسوی کے دوران اس عظیم سلطنت کا قلع قمع ہو گیا یہاں تک کہ ۱۴۹۲ء میں سقوط غرناطہ کے بعد تو بعینہٖ وہ صورت پیدا ہو گئی جس کا نقشہ قرآن مجید میں عذاب استیصال کا نزولہ بننے والی قوموں کے بیان میں کھینچا جاتا ہے یعنی " كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا !" اور " لَا يُرٰى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ !"

' جیسے کہ وہ کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے ' اور ' اب ان کے ویران مسکنوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا ' !

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نے نیا بحری راستہ تلاش کیا اور اس کے فوراً بعد یورپی استعمار کا سیلاب عالم اسلام کے میمنہ پر ٹوٹ پڑا اور انڈونیشیا، ملایا اور ہندوستان مختلف یورپی اقوام کے استبدادی پنجوں میں جکڑے گئے اور یہ عمل جس کا آغاز سولھویں صدی عیسوی سے ہوا، اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں عالم اسلام کے دائیں بازو کی حد تک اپنے عروج (ZENITH) کو پہنچ گیا۔

اس اثنا میں دولت عثمانی بھی اپنے شباب کے دور سے گزر آئی تھی اور اب اس نے بھی مرد بیمار کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ گویا عالم اسلام کے قلب میں آٹھ صدیوں کے بعد پھر وہی قوت کا خلا پیدا ہو گیا جو گیارھویں صدی عیسوی میں دولت عباسیہ کے اضمحلال کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اور قوت کے دباؤ کی اس کمی کے باعث مغربی استعمار کا رخ عالم اسلام کے قلب کی جانب مڑ گیا اور گویا اس کے اعتبار سے بھی " وَعْدُ الْاٰخِرَةِ " کا وقت آپہنچا۔

عالم اسلام کے قلب پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے اس دوسرے دور کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہو گیا تھا چنانچہ پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب دنیا کا نیا نقشہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ عظیم دولت عثمانیہ سمٹ سمٹا کر ایشیائے کوچک میں محدود ہو گئی اور شمالی افریقہ سمیت پورا عالم عرب چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر مختلف یورپی اقوام کے براہ راست زیرنگیں ہو گیا یا بالواسطہ

محکومی میں آ گیا اور ہو بہو وہی کیفیت پیدا ہو گئی جس کی خبر مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دی تھی کہ " ایک زمانہ آئے گا کہ اقوام عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی اس طرح دعوت دیں گی جیسے کسی دعوتِ طعام کا اہتمام کرنے والا دسترخوان چنے جانے پر مہمانوں کو بلایا کرتا ہے ! "

اس طرح بحیثیت مجموعی اُمّت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دورِ ثانی کی تکمیل اس صدی کے ربع اوّل میں ہو گئی تھی جبکہ پورا عالم اسلام مغربی استعمار کے ناپاک شکنجے میں جکڑا گیا۔ اگرچہ خاص " اُمیّین " کے حق میں " وَعْدُ الْآخِرَةِ " کی وہ مکمل صورت جو " لِيَسُوْٓءُا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ "[۱] کے الفاظ میں بیان ہوئی تھی تقریباً نصف صدی بعد ۱۹۶۷ء میں ظاہر ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ایک مغضوب و ملعون قوم کے ہاتھوں ایک شرمناک اور ذلت آمیز شکست دلوائی اور عربوں کے عہدِ تولیت کے دوران ایک بار پھر مسجد اقصیٰ[۲] کی حرمت پامال ہوئی اور بیت المقدس ان کے ہاتھوں سے نکل کر یہود کے قبضے میں چلا گیا اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس بار یہ قبضہ کتنا طویل ہو گا!

اس داستان کا الم ناک ترین باب یہ ہے کہ مغربی استعمار نے امّت مسلمہ کی وحدتِ ملّی کو پارہ پارہ

---

[۱] سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷: "تو پھر جب آیا وقت دوسرے وعدے کا (تو مسلّط کئے تم پر وہ لوگ) تاکہ حلیہ بگاڑ دیں تمہارا اور گھس جائیں مسجد (اقصیٰ) میں جیسے کہ گھُسے تھے پہلی بار اور تباہ و برباد کر دیں جس پر بھی قابو پائیں!"

[۲] یہ ایک عجیب تاریخی حقیقت ہے کہ روئے ارضی کے دو قبلوں میں سے بے حرمتی اور پامالی کا معاملہ چاروں مرتبہ مسجد اقصیٰ ہی کے ساتھ ہوا جسے غلطی سے قبلۂ اوّل کہہ دیا جاتا ہے۔ واضح رہنا چاہئیے کہ قبلۂ اوّل بیت اللہ اور مسجد حرام ہے (بفحوائے الفاظ قرآنی "اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ ") اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو خاص معاملہ رہا ہے وہ واقعہ فیل سے ظاہر ہے اور راقم کو تو یہی حکمت نظر آتی ہے اس میں کہ مسلمانوں کے سیاسی مرکز کو رفتہ رفتہ اس قبلۂ اوّل سے دُور سے دُور تر کیا جاتا رہا تاکہ اس اُمّت کو کبھی جب عذاب الٰہی سے واسطہ پڑے تو اس کے ساتھ خانہ کعبہ کی حرمت بھی مجروح نہ ہو۔ چنانچہ خلافت راشدہ ہی کے اواخر میں مرکز عالم اسلام مدینہ منورہ سے کوفہ منتقل ہو گیا۔ پھر وہاں سے بھی دمشق اور بغداد کی جانب نقل مکانی ہوئی اور بالآخر انتہائی شمال یعنی قسطنطنیہ کو عالم اسلام کے "دارالخلافہ" کی حیثیت حاصل ہو گئی اس طرح بیت اللہ کم از کم اغیار و اعداء کی دست برد سے ہمیشہ محفوظ رہا۔ (یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کے تقدّس پر دو ایک مرتبہ خود ان لوگوں کے ہاتھوں کسی قدر آنچ آئی جو اپنے آپ کو مسلمان کہلواتے تھے!) اسرار احمد

کر دیا اور اس صدی کے آغاز ہی میں نسلی اور علاقائی عصبیتوں کے وہ بیج مسلمان اقوام کے دلوں میں بو دیئے جو ابھی تک برگ و بار لا رہے ہیں۔ چنانچہ پہلے انہوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا۔ نتیجتہً عالم اسلام کا قلب دولخت ہو گیا اور وحدتِ ملی کے علامتی ادارے (SYMBOL) یعنی خلافت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ پھر عالم عرب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ نسلی اور لسانی اشتراک کے باوجود عالم عرب کے کامل اتحاد کا امکان تا حال دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔

اسی نسلی تعصب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے اس عذاب کا مزہ بھی اُمّت مسلمہ کو چکھنا پڑا جو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ "اَوْ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ" یعنی تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور پھر چکھائے ایک کو دوسرے کی جنگی قوت کا مزہ! چنانچہ اس صدی کے آغاز میں عربوں کے ہاتھوں ترکوں کا خون بہا اور پھر ۱۹۷۱ء میں بنگالی مسلمان کے ہاتھوں غیر بنگالی مسلمان کے خون کی ہولی اور جان و مال اور عزّت و آبرو کی دھجیاں بکھرنے کا منظر چشم فلک نے دیکھا۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ!

بہرحال ہمارے نزدیک "اُمیّین" کے لئے ۱۹۷۱ء کی ذلّت اور "آخرین" کے ایک اہم حصّے کے لئے ۱۹۷۱ء کی رسوائی کو اُمّت مسلمہ کے زوال و انحطاط کی آخری حد کی حیثیت حاصل ہے اور اگرچہ "وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا"[1] کی مستقل وعید اب بھی موجود ہے۔ تاہم ہمارا گمان یہ ہے کہ اب "عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ" ہی کی شان کا ظہور ہوگا اور انشاء اللہ العزیز اب کلنک کا کوئی اور ٹیکہ اُمّت محمدؐ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کی پیشانی پر نہیں لگے گا!

ہمارے لئے تو اس امید کی حیثیت ایک خالص داخلی (SUBJECTIVE) اور وجدانی احساس کی بھی ہے لیکن اس کے بعض نہایت قوی شواہد بھی خارج میں موجود ہیں۔ مثلاً:-

ایک طرف "اُمیّین" کے حالات میں گزشتہ پانچ چھ برس میں نمایاں تبدیلی پیدا ہو چکی ہے چنانچہ ۱۹۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں انہوں نے جس بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا،

---

[1] سورۂ بنی اسرائیل آیت ۸: "بعید نہیں کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے لیکن اگر تم نے پھر وہی کچھ کیا تو ہم بھی دوبارہ وہی کچھ کریں گے!"

اس نے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا اور ۱۹۶۷ء کی ذلت و رسوائی کے داغ کو اگر بالکل دھو نہیں دیا تو کم از کم دھندلا ضرور کر دیا۔ پھر ان کی صفوں میں انتشار کا بھی اب وہ عالم نہیں رہا اور تمام اختلافات کے باوجود اب ان میں اتحاد کی ایک شان بھی نمایاں نظر آتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلح جنگ کے بعد ڈپلومیٹک جنگ کے میدان میں انہوں نے "تیل کا ہتھیار" جس مہارت اور خود اعتمادی کے ساتھ استعمال کیا اور امریکہ ایسی "سپر پاور" تک کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اس نے ان کی سیاسی بالغ نظری کا بھی ایک نہایت درخشاں ثبوت فراہم کر دیا ہے۔ گویا علامہ اقبال کا وہ خواب اب حقیقت کا جامہ پہنتا نظر آ رہا ہے جو انہوں نے اپنے اس شعر میں بیان کیا تھا ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا!

دوسری طرف "اخرین" میں سے ترکوں نے قبرص کے حالیہ بحران میں جو جرأت مندانہ اور باوقار طرز عمل اختیار کیا اس نے یقیناً پوری دنیا کے مسلمانوں کی عزت میں اضافہ کیا ہے۔ ادھر خود پاکستان نے ۱۹۷۱ء کے ذلت آمیز حوادث کے بعد جس طرح اپنے آپ کو سنبھالا ہے اس کی تعریف بھی پوری دنیا میں کی گئی ہے۔ نتیجۃً مسز اندرا گاندھی نے "ایک ہزار سالہ شکست کے انتقام" کی مسرت سے سرشار ہو کر "چند ہی ماہ میں ایک اور عظیم خوش خبری" سنانے کا جو وعدہ اپنی قوم سے کیا تھا وہ نہ صرف یہ کہ ہنوز شرمندۂ تکمیل ہے بلکہ کم از کم مستقبل قریب (FORE-SEEABLE FUTURE) کے اعتبار سے تو خواب و خیال ہی بن کر رہ گیا ہے۔

اور تیسری طرف "امیین" اور "اخرین" کے باہمی تعلقات کے ضمن میں بھی ایک نہایت خوشگوار دور کا آغاز ہو چکا ہے چنانچہ پاکستان نے تو گویا رفتہ رفتہ عرب دنیا کے ایک جزو لاینفک ہی کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ قبرص کی حالیہ جنگ کے دوران ترکوں کو بہت عرصے کے بعد عربوں کی جانب سے جو حمایت حاصل ہوئی وہ بھی بہت حوصلہ افزا اور امید پرور ہے اور اسی سال کے آغاز میں جو عالمی اسلامی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی تھی اور جس کے دوران نہایت مسرت بخش اور روح پرور مناظر دیکھنے میں آئے تھے اس نے تو گویا اتحاد ملت اسلامیہ کا وہ نقشہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا جس کی خبر نصف صدی قبل علامہ اقبال مرحوم نے ان الفاظ میں دی تھی کہ ؎

کتاب ملت بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

(۴)

جہاں تک تجدیدی مساعی کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ تاریخ اسلام کا کوئی دور بھی ان سے بالکل خالی نہیں رہا اور ہر زمانے اور ہر ملک میں ایسے اولوالعزم لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اپنے حالات کے تقاضوں کے مطابق اصلاحی اور تجدیدی کارنامے سرانجام دیئے۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی سے قبل کی ایسی تمام کوششوں کے بارے میں ایک اصولی بات پیش نظر رہنی چاہیئے اور وہ یہ کہ ان کی اصل نوعیت "احیاءِ دین" کی نہیں بلکہ حفاظت و مدافعتِ دین کی تھی۔ اس لئے کہ ابھی اسلام کا قصرِ عظیم بالکل زمیں بوس نہیں ہوا تھا اور خواہ دین کی حقیقی روح کتنی ہی مضمحل اور پژمردہ ہو چکی ہو بہرحال اسلام نے جو تہذیبی اور عمرانی نظام دنیا میں قائم کیا تھا اس کا ڈھانچہ برقرار (INTACT) تھا حتیٰ کہ شریعت اسلامی تمام مسلمان ممالک میں بالفعل نافذ تھی چنانچہ تمام تجدیدی مساعی کا اصل ہدف یہ رہا کہ دین کا نظام عقائد و اعمال محفوظ اور اپنی اصل صورت میں قائم رہے اور خارجی و بیرونی اثرات دین کو مسخ نہ کر دیں۔

یہی وجہ ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے دور تک کے تمام مجددین امت علیہم الرحمۃ کی مساعی اکثر و بیشتر علم و فکر کے میدان ہی تک محدود رہیں اور عقاید و نظریات کی تصحیح و اصلاح ہی کو ان کے اصل ہدف کی حیثیت حاصل رہی اور اس سے آگے اگر قدم بڑھا بھی تو زیادہ سے زیادہ اصلاح اخلاق و اعمال، تزکیۂ نفس اور تربیت روحانی تک، اس سے آگے بڑھ کر گزشتہ صدی سے قبل کسی بھی مجدد دین کی مساعی نے سیاسی یا عسکری تحریک کی صورت اختیار نہیں کی[1]

---

[1] اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان حکمرانوں کے خلاف "خروج" یعنی مسلح بغاوت پر نہایت سخت بندشیں عاید فرمادی تھیں اور جب تک ان کے ہاتھوں شریعت اسلامی کا نفاذ ہو رہا تھا اور کسی "کفرِ بواح" یعنی کھلے اور صریح کفر کی ترویج و تنفیذ نہیں ہو رہی تھی ان کے ذاتی فسق و فجور اور ظلم و جور کے باوجود ان کے خلاف مسلح بغاوت ممکن نہ تھی!

یہی وجہ ہے کہ جیسے ہی یہ صورت حال تبدیل ہوئی اور حکومت مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر مسلم اقوام کے ہاتھوں میں آئی دفعتہً ان مساعی میں عسکریت بھی پیدا ہو گئی جس کی نہایت شاندار اور تابناک مثال خانوادہ ولی اللہی ہی کے زیر اثر برپا ہونے والی تحریک شہیدینؒ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کو سابق مجدّدین کا تجدیدی کام "جزوی" نظر آتا ہے اور انہیں حیرت ہوتی ہے کہ امّت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ میں کوئی ایک بھی "مجدّدِ کامل" پیدا نہیں ہوا۔

حالانکہ بات بالکل واضح اور سیدھی ہے کہ ابھی عمارت بالکل منہدم ہوئی ہی نہ تھی کہ بالکل نئی تعمیر کی حاجت ہوتی بلکہ صرف شکستہ و بوسیدہ ہوتی تھی اور ضرورت ہی صرف جزوی اصلاح و استحکام کی تھی۔

یہ تو، جیسا کہ ہم مفصّل عرض کر چکے ہیں اس بیسویں صدی کے آغاز میں ہوا کہ ملّت اسلامی کا بوسیدہ قصر گویا دفعتہً زمین پر آرہا اور اسلام اور مسلمان دونوں اپنے زوال و انحطاط کی آخری حدوں کو پہنچ گئے اور ایک[1] طرف کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کی حالت حدیث نبوی کے الفاظ کے مطابق "غُثَاءُ السَّیل" یعنی سیلاب کے جھاگ سے زیادہ نہ رہی اور دوسری[2] طرف اسلام اور قرآن دونوں بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ کے مطابق اس حال کو پہنچ گئے کہ "لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُہٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُہٗ"[1] لہٰذا قانون فطرت کے عین مطابق احیاء کا ہمہ جہتی عمل شروع ہو گیا۔

اس احیائی عمل کے بارے میں بھی بعض بنیادی حقائق ذہن نشین رہنے چاہئیں۔ مثلاً ایک[1] یہ کہ یہ کوئی سادہ اور بسیط عمل نہیں ہے بلکہ اس کے متعدّد گوشے ہیں جن میں سے ہر ایک میں اولوالعزم افراد اور جماعتیں برسرکار ہیں اور جو بظاہر ایک دوسرے سے جدا اور مختلف بلکہ بعض پہلوؤں کے اعتبار سے متضاد ہونے کے باوجود اس وسیع تر احیائی عمل کے اعتبار سے ایک دوسرے کے لئے باعث تقویت ہیں۔ دوسرے[2] یہ کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور ملّت اسلامی کی تجدید کا یہ کام دس بیس برس میں مکمل ہونے والا نہیں ہے بلکہ "لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ"[2] کے مصداق درجہ بدرجہ بہت سے مراتب و مراحل سے گزر کر ہی پایۂ تکمیل کو پہنچے گا لہٰذا اس ارتقائی عمل کا ہر درجہ اپنی جگہ اہمیت کا حامل ہے اور چاہے بعد کے مراحل کے اعتبار سے پہلوں کا کام بہت حقیر بلکہ کسی قدر غلط بھی نظر آئے، اپنے اپنے دور

---

[1] "ایک زمانہ وہ آئے گا کہ اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے کچھ باقی نہ رہے گا اور قرآن میں سے بھی سوائے اس کے رسم الخط کے اور کچھ نہ بچے گا۔" مشکوٰۃ شریف، کتاب العلم

[2] سورۂ انشقاق آیت ۱۹: "تم لازم چڑھو گے سیڑھی بہ سیڑھی!"

کے اعتبار سے اس کی اہمیت و وقعت سے بالکلیہ انکار ممکن نہیں۔ تیسرے یہ کہ اس ہمہ گیر تجدیدی جد وجہد میں اگرچہ افراد کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے[1] تاہم جماعتوں اور تنظیموں کے مقابلے میں کم تر ہے۔ پھر جماعتیں بھی تحریکوں کی وسعت میں گم ہو جاتی ہیں اور بالآخر تمام تحریکیں بھی اس وسیع احیائی عمل کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہیں جو ان سب کو محیط ہے۔

ماضی میں ان حقائق کے پیش نظر نہ رہنے کے باعث بہت سے لوگوں کے دلوں میں "مہدیٔ موعود" یا "مجدّد کامل" بننے کا شوق پیدا ہوتا رہا ہے جس کے نتیجے میں طرح طرح کے فتنے اٹھتے رہے ہیں اور اچھی بھلی تعمیری کوششوں کا رُخ تخریب کی جانب مڑ جاتا رہا ہے!

اس احیائی عمل کا اوّلین مرحلہ مسلمان اقوام کا مغربی استعمار کے براہ راست تسلّط سے نجات کا حصول تھا جو بحمد اللہ گزشتہ تیس چالیس سال کے دوران تقریباً مکمل ہو چکا ہے اور اگرچہ اب بھی ہم مغرب کی علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی غلامی میں مبتلا ہیں اور اقوام مغرب کی سائنسی و تکنیکی بالادستی کے باعث بہت سے پہلوؤں سے ان کے دست نگر بھی ہیں تاہم خدا کا شکر ہے کہ ایک قضیۂ فلسطین سے قطع نظر اور صرف کشمیر اور اریٹیریا کے علاوہ پورے کرۂ ارضی پر مسلم اکثریت کا کوئی علاقہ براہ راست غلامی و محکومی کی لعنت میں گرفتار نہیں رہا۔

خالص اصولی و نظریاتی اور تصوّریت پسندانہ (IDEALISTIC) نقطۂ نظر سے تو "مسلمان اقوام" کی اصطلاح ہی قطعاً غلط ہے۔ اس لئے کہ از روئے قرآن و حدیث مسلمانوں کی حیثیت ایک جماعت یا اُمّت یا حزب کی ہے نہ کہ قوم کی۔ اور وہ ایک ناقابل تقسیم 'وحدتِ ملّی' میں منسلک ہیں جس میں تعدّد و تکثّر کا امکان ہی موجود نہیں کہ اقوام کا لفظ صحیح قرار دیا جا سکے ـــــ لیکن واقعیت پسندانہ (REALISTIC) نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے ایک جماعت یا اُمّت یا حزب کا کردار (ROLE) تو بہت پہلے ترک کر دیا تھا اور بالفعل ایک قوم ہی کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ البتہ وحدتِ ملّی کا تصوّر اس صدی کے آغاز تک برقرار تھا۔ لیکن، جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں اس صدی کے ربع اوّل کے دوران مغربی

---

[1] بقول علامہ اقبالؒ ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارا

استعمار کے ہتھکنڈوں نے اسے بھی ختم کر کے رکھ دیا تھا اور اس وقت فی الواقع رُوئے ارضی پر کوئی ایک "ملت مسلمہ" آباد نہیں ہے بلکہ بہت سی مسلمان اقوام آباد ہیں۔

اسی طرح خالص تصوّریت پسندانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ع "نشّہ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے!" کے مصداق مسلمانوں کی آزادی اور خود مختاری کا احیائے اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن واقعیت پسندانہ نگاہ سے دیکھیے تو مستقبل کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کی علمبرداری کی سعادت کسی بالکل ہی نئی قوم کے حوالے فرما دے اور "یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَ کُمْ" کی شان دوبارہ ظاہر ہو۔ لیکن بحالاتِ موجود تو ع "کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے!" کے مصداق اسلام کا مستقبل موجودہ مسلمان اقوام ہی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور دونوں باہم لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اندریں حالات، مسلمان اقوام کا آزادی و خود اختیاری کی نعمت سے ہمکنار ہونا یقیناً احیائے اسلام ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے اور جن تحریکوں کے ذریعے یہ مشکل مرحلہ سر ہوا ہے ان کی سعی بھی اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہی کی جد و جہد کا جزو قرار پائے گی۔ رہا یہ شبہ کہ ان میں سے اکثر کے قائدین اور زعماء کا دین و مذہب کے ساتھ کوئی واقعی اور عملی تعلق نہ تھا تو اسی کا جواب ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظِ مبارکہ میں کہ "اِنَّ اللّٰہَ یُؤَیِّدُ الدِّیْنَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ" (بخاری: کتاب الجہاد) واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے کام بہت نرالے ہیں اور اس کی تدبیریں بہت لطیف اور مخفی اور اس کے منصوبے بہت طویل الذیل اور وسیع الاطراف ہوتے ہیں اور وہ بسا اوقات فسّاق و فجّار سے اپنے دین کی خدمت لے لیتا ہے۔ "وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝"

اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ اگرچہ مختلف مسلمان ممالک میں حصول آزادی کی تحریکوں کی تقویت کے لئے جن علاقائی یا نسلی عصبیتوں کو استعمال (INVOKE) کیا گیا انہیں بھی خالص اصولی اور نظری اعتبار سے اسلام کے نظامِ فکر کے ساتھ سوائے تباین و تضاد کے کوئی نسبت حاصل نہیں ہے، لیکن عالم واقعہ میں اس کے سوائے کوئی چارہ کار موجود نہ تھا اس لئے کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا ذہنی و قلبی رشتہ اتنا قوی نہ رہا تھا کہ اسے کسی جاندار اور فعّال تحریک کی اساس بنایا جا سکتا اور حصول استقلال کے لئے جس مؤثر مزاحمت (EFFECTIVE RESISTANCE) کی ضرورت ہوتی ہے اس کی بُنیاد خیالی یا جذباتی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی اساسات ——————

(CONCRETE GROUNDS) ہی پر رکھی جا سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ترک نیشنلزم کا جذبہ فوری طور پر بیدار نہ ہو گیا ہوتا تو شاید آج ترکی کا نام و نشان بھی صفحۂ ارضی پر موجود نہ ہوتا اسی طرح اسلام سے جتنا کچھ حقیقی اور واقعی تعلق اس وقت مسلمانان عرب کو ہے وہ کسے معلوم نہیں۔ اندریں حالات عرب نیشنلزم ہی یورپی سامراج کے چنگل سے نکلنے کی جد و جہد کے لئے واحد موجود (THE ONLY AVAILABLE) بنیاد بن سکتا تھا اور ایک وقتی ضرورت اور دفاعی تدبیر کی حد تک اس کے استعمال میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے بشرطیکہ اسے نظام فکر کی مستقل اساس کے طور پر قبول نہ کر لیا جائے اور حصول آزادی کے عبوری مقصد کی تکمیل کے بعد صحیح اسلامی فکر اور وحدت ملی کے شعور و احساس کو اجاگر کیا جائے!

اس پس منظر میں دیکھئے تو تحریک پاکستان کا معاملہ بالکل منفرد نظر آتا ہے۔ برصغیر کے مسلمان بھی اگر برطانوی استعمار سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہندی قومیت کی اساس پر غیر مسلموں کے ساتھ اشتراک عمل کرتے تو اس کے لئے بھی وجہ جواز موجود تھی۔[1] لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ یہاں کے مخصوص حالات کے باعث مسلمانان ہند نے اپنی سیاسی جد و جہد کا آغاز ہی "مسلم قومیت" کی اساس پر کیا جس کے نتیجے میں وہ ملک وجود میں آیا جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح جو اپنا نام "سلمان ابن اسلام" بتایا کرتے تھے، صرف اور صرف "فرزند اسلام" قرار دیا جا سکتا ہے اور جس کے قیام اور بقا کے لئے کوئی وجہ جواز سوائے اسلام کے موجود نہیں ہے۔ گویا پاکستان ع "خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ!" کے مصداق اپنی پیدائش (GENESIS) اور ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے تمام مسلمان ممالک سے ایک قدم آگے ہے اور دوسروں کو ع "قبائل ہوں ملت کی وحدت میں گم!" کا جو کٹھن مرحلہ ابھی طے کرنا ہے وہ کم از کم اصولی اور نظری اعتبار سے یہاں پہلے ہی سے طے شدہ ہے!

مسلمانان ہند کی سیاسی جد و جہد کو اس رُخ پر ڈالنے والے اسباب و عوامل میں سلبی و منفی طور پر سب

---

[1] چنانچہ جمعیت علمائے ہند کی سیاسی جد و جہد اسی اصول پر مبنی تھی بلکہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خود نوشت سوانح "نقش حیات" میں تو ثابت کیا ہے کہ خود مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ مسلمانان پنجاب کو "سکھا شاہی" سے نجات دلانے کے بعد اسی اساس پر انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے!

سے زیادہ دخل ہندوؤں کی روایتی تنگ نظری اور تنگ دلی اور اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں سے اپنی "ہزار سالہ شکست کا انتقام" لینے کے اس جذبے کو حاصل ہے جو ان کے سینوں میں کھولتے ہوئے لاوے کی طرح پک رہا تھا اس اعتبار سے دیکھا جائے تو گویا ان کا یہ طرز عمل بھی اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے ممد و معاون بن گیا اور ہم اپنے سابق ابنائے وطن کی خدمت میں بجا طور پر عرض کر سکتے ہیں کہ ؎

تو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لئے!

مثبت اسباب کے ضمن میں ایک اور حقیقت پیش نظر رہنی چاہیئے کہ مسلمانان ہند کے دلوں میں پہلے بھی جذبۂ ملی باقی تمام دنیا کے مسلمانوں سے زیادہ تھا۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ تنسیخ خلافت (ABOLITION OF CALIPHATE) پر جس قدر شدید ردعمل یہاں ظاہر ہوا اس کا عشر عشیر بھی کہیں اور نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ایک وقت تھا کہ برصغیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں سب کی مشترک سیاسی جدّ و جہد کا عنوان ہی "تحریک خلافت" بن گئی تھی ——— اور دوسرے یہ کہ اس خطے میں علامہ اقبال مرحوم ایسی عظیم شخصیت پیدا ہوئی جس کی انتہائی پُرسوز و پُر تاثیر حدی خوانی نے قافلۂ ملی کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور مسلمانان ہند کو جذبۂ ملی سے سرشار کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پوری امت مسلمہ پر علامہ مرحوم کا ایک بہت بڑا احسان ہے اور بلاشبہ ان کی ملی شاعری کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کی وسیع الاطراف جدّ و جہد میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

اور اس پس منظر (CONTEXT) میں دیکھا جائے تو عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس کا پاکستان اور خاص طور پر اس شہر لاہور میں انعقاد بہت معنی خیز ہے۔ جہاں قریباً ثلث صدی قبل قرار دادِ پاکستان بھی منظور ہوئی تھی اور جہاں دورِ حاضر میں قافلۂ ملت اسلامیہ کا وہ سب سے بڑا حدی خواں بھی مدفون ہے جو آخری دم تک یہ صدا لگاتا رہا کہ :

بیا تا کارِ ایں اُمت بسازیم تمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر دلے در سینۂ مُلّا گدازیم

اس ہمہ جہتی احیائی عمل کا دوسرا اہم گوشہ وہ ہے جس میں علمائے کرام کی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں سرگرم کار اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف و مشغول ہیں۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی برصغیر ہند و پاک کو پورے عالم اسلام میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے چنانچہ علمائے دین کو جس قدر اثر (HOLD) یہاں کے مسلمان عوام پر حاصل ہے وہ دنیا

میں کہیں اور نظر نہیں آتا اور راسخ العقیدہ اسلام (ORTHODOX ISLAM) جتنی مضبوط جڑیں یہاں رکھتا ہے کہیں اور نہیں رکھتا۔ حتیٰ کہ جزیرہ نمائے عرب بھی، جہاں اس صدی کے وسط تک محمد ابن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کی تجدیدی مساعی کے گہرے اثرات قائم رہے ہیں اب اس معاملے میں بہت پیچھے رہ گیا ہے!

اس کی وجہ بھی بادنیٰ تامل سمجھ میں آجاتی ہے اور وہ یہ کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ایسی جامع شخصیت گزشتہ تین سو سالوں کے دوران میں پورے عالم اسلام میں پیدا نہیں ہوئی اور انہوں نے مسلمانوں کی توجہ علم دین کے اصل سرچشموں یعنی قرآن اور حدیث کی جانب منعطف کرانے کے ساتھ ساتھ فکر اسلامی کی تدوینِ نو کا جو عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں دین اور رجالِ دین کی ساکھ ازسرِ نو مضبوط ہو گئی۔

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ علمائے دین کی مساعی میں اصل زور (EMPHASIS) دورِ حاضر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے دین کے نظام عقائد و اعمال کی حفاظت و مدافعت ہی پر ہے۔ اس طرح گویا ظاہری اعتبار سے ان کی خدمات کو سابق مجدّدین اسلام کی مساعی کے ساتھ ایک نوع کے تسلسل کی نسبت حاصل ہے۔ اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے بعض اہم فرق بھی ہیں مثلاً ایک یہ کہ جب سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوا اور تقلیدِ جامد کا دور دورہ ہوا اور تشتّت و انتشار اور فرقہ پرستی و گروہ بندی نے پاؤں جمائے، ہر فرقے کے علماءِ کرام دین کے نظام عقاید و اعمال کی خاص اسی صورت کی حفاظت و مدافعت پر سارا زور صرف کر رہے ہیں جو ان کے مخصوص فرقے یا گروہ کے نزدیک معتبر و مستند ہے جس سے فرقہ بندی کی جڑیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے علومِ جدیدہ اور دورِ حاضر کے افکار و نظریات کا مطالعہ اس طرح براہ راست اور بالاستیعاب نہیں کیا جس طرح اپنے اپنے دور میں امام غزالی اور امام ابن تیمیہ رحمہما اللہ نے کیا تھا لہٰذا وہ دورِ حاضر میں حفاظت و مدافعت دین کے اصل تقاضوں کو بھی صحیح طور پر پورا کرنے سے قاصر ہیں۔

---

[1] ۱۹۶۸ء میں جو ایجی ٹیشن ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی تصنیف "ISLAM" کے خلاف ہوا تھا اور اب جو تازہ "معجزہ" قادیانی مسئلے کے حل کی صورت میں صادر ہوا ہے وہ اس کے منہ بولتے ثبوت ہیں!

لہٰذا دور حاضر میں علمائے دین کی حیثیت دین کے جہاز کو آگے بڑھانے والی قوت فراہم کرنے والے انجن کی تو نہیں ہے البتہ کم از کم برصغیر پاک و ہند کی حد تک ایک ایسے بھاری لنگر کی ضرور ہے جو اس کشتی کو غلط رُخ پر بڑھنے سے روکنے کی خدمت بہر حال سرانجام دے سکتا ہے اور فی زمانہ یہ بھی ایک اہم خدمت ہے!

برصغیر میں اس سلسلے میں ایک اہم مقام اور مرتبہ دیوبندی مکتب فکر کو حاصل ہے جو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے 'فکر' کا نہ سہی 'علم' کا وارث ضرور ہے اور جس کی کوکھ سے دینی مدرسوں اور دارالعلوموں کے ایک عظیم سلسلے کے علاوہ ایک عظیم تحریک بھی برآمد ہوئی ہے جس نے راسخ العقیدہ اسلام کی جڑوں کی آبیاری کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کو حقائق ایمانی پر مرتکز (FOCUS) کر دیا اور جس کے زیر اثر کم از کم ایسے لوگ ضرور دین سے قریب ہو رہے ہیں جن کے اذہان فکری و نظری اشکالات سے خالی ہوتے ہیں اور جن کے قلوب میں نیکی کا ایک جذبہ خواہ نیم خوابیدہ حالت ہی میں سہی بہر حال موجود ضرور ہوتا ہے۔ ہماری مراد 'جماعت تبلیغی' سے ہے جس نے اس دور میں دین و مذہب کے نام پر ایک عظیم حرکت عالم اسلام ہی نہیں، دیار غیر میں بھی برپا کر دی ہے اور جس کے زیر اثر محدود پیمانے ہی پر سہی بہر حال 'تجدید ایمان' کی ایک تحریک بالفعل برپا ہو گئی ہے اور جسے بلاشبہ زیر بحث 'ہمہ جہتی احیائی عمل' میں ایک اہم مقام حاصل ہے

اس 'ہمہ جہتی احیائی عمل' کا تیسرا اور اہم ترین گوشہ وہ ہے جس میں وہ جماعتیں اور تنظیمیں برسرکار ہیں جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئیں اور جنہیں اب اس احیائی عمل کے اعتبار سے گویا مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے! مختلف مسلمان ممالک میں ایسی جماعتیں اور تنظیمیں مختلف ناموں کے تحت کام کرتی رہی ہیں لیکن ؎ "ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم" اور "ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم" کے مصداق ان کی حیثیت ایک ہی تحریک کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہیئتوں کی ہے۔

ان جماعتوں میں سے اگرچہ ایک دور میں جوش اور جذبے کی شدت اور اثر و نفوذ کی وسعت کے اعتبار سے مصر کی 'الاخوان المسلمون' نوجوانوں اور امیدوں کا مرکز بن گئی تھی لیکن واقعہ یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برصغیر ہند و پاک ہی کو حاصل ہے۔

برصغیر میں اس تحریک احیائے دین کے مؤسس اوّلین اور داعی اوّل کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد

مرحوم کو حاصل ہے جنہوں نے اس صدی کے بالکل اوائل میں "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعے "حکومت الٰہیہ" کے قیام اور اس کے لئے ایک "حزب اللہ" کی تاسیس کی پُرزور دعوت پیش کی۔ مولانا کے مخصوص طرز نگارش اور انداز خطابت نے خصوصاً تحریک خلافت کے دوران میں ان کی شہرت کو برصغیر کے طول وعرض میں پھیلایا اور ان کی دعوت نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ لیکن اس کے بعد خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس سبب سے انہوں نے اس عظیم مشن کو خیرباد کہہ کر انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی اور باقی پوری زندگی پوری یکسوئی اور کمال مستقل مزاجی کے ساتھ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست کی نذر کر دی۔

مولانا کی زندگی کے اس عظیم انقلاب کے ممکن اسباب میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی ذہانت کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے کہ ع "اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی!" مولانا بلاشبہ عبقری تھے اور عبقری انسان زیادہ عملی نہیں ہوا کرتے۔ اس کا کچھ سراغ ان کے اس جملے میں بھی ملتا ہے کہ "ہم بیک وقت گلیم زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے جرم کے مرتکب ہیں" اور ایک خیال جو زیادہ قرین قیاس ہے یہ بھی ہے کہ مولانا کی حیثیت ایک سکہ بند اور مسلّم عالم دین کی نہ تھی اور اس وقت تک مسلمانانِ ہند پر علماء کی گرفت بہت مضبوط تھی لہٰذا مولانا کو گویا راستہ بند نظر آیا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کے ذریعے ہم تک پہنچی اور جس کا حاصل یہ ہے کہ دس سال کے عرصے میں[1] اپنے پیش نظر مقصد کے لئے تمہیدی مراحل کی تکمیل کے بعد اپریل ۱۹۲۲ء میں مولانا نے دہلی میں منعقدہ جمعیت علمائے ہند کی کانفرنس میں مفتی کفایت اللہ مرحوم اور مولانا احمد سعید مرحوم کے تعاون سے اگلا قدم اٹھانے کی سکیم بنائی۔ چنانچہ پہلے خود انہوں نے تقریر کی اور اپنے جوشِ خطابت سے حاضرین کے جذبہ عمل کو ابھارا ہی نہیں للکارا۔ اور پھر مولانا احمد سعید صاحب نے تقریر کی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی رحلت کے بعد سے مسلمانانِ ہند کی قیادت کی مسند خالی ہے۔ اور اب جو مرحلہ درپیش ہے اس میں "شیخ الہند" سے بھی بڑھ کر "امام الہند" کی ضرورت ہے۔ اب غور کرو اور اس کے لئے کسی موزوں شخص کو تلاش کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کرو اور جد وجہد کا آغاز کر دو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی مطلوب تھا۔ چنانچہ علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری اٹھے اور انہوں نے براہ راست مولانا آزاد کو خطاب کر کے ان الفاظ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا کہ "ایاز قدرِ خود بشناس!" جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پوری تقریر میں کیا کچھ ہوگا۔ بہرحال اس سے دل شکستہ اور

[1] "الہلال" کا اجراء ۱۹۱۲ء میں ہوا تھا!

دل برداشتہ ہو کر مولانا اس کام ہی سے دست کش ہو گئے اور اس کے فوراً بعد ہی انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی!

اس طرح مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم تو میدان چھوڑ گئے لیکن ان کی زور دار دعوت کی گھن گرج سے مسلم انڈیا کی فضائیں دیر تک گونجتی رہیں اور پھر کم و بیش دس ہی سال بعد ایک باہمت نوجوان نے مولانا کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ان کے ترک کردہ مشن کو اختیار کرنے کے عزم مصمم کے ساتھ ان کی تفسیر 'ترجمان القرآن' ہی کے ہم نام ماہنامے کی ادارت سنبھالی اور اس کے ذریعے 'اسی' حکومت الٰہیہ' کے قیام کا نصب العین اور "تجدید و احیائے دین" کی سعی کا ایک نقشہ مسلمانان ہند کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔

اس نوجوان میں مولانا مرحوم کی بہ نسبت جوش کم تھا، ہوش زیادہ، ذہانت و فطانت قدرے کم تھی لیکن اسی نسبت سے محنت و مشقت کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ لہٰذا اس نے پہلے چھ سات برس تک پورے صبر و استقلال کے ساتھ خالص انفرادی طور پر کام جاری رکھا۔ کچھ عرصہ 'دار الاسلام' کے نام سے ایک ادارے کے تحت کام کیا اور بالآخر ۱۹۴۱ء میں 'جماعت اسلامی' کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھ دی اور ایک منظم جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

جماعت کے قیام سے قبل اس نوجوان نے پہلے انڈین نیشنل کانگریس میں شامل یا اس کے حلیف علماء کے موقف پر شدید تنقید کی اور اپنے زور استدلال سے ان کے طریق کار کا انجام کار کے اعتبار سے اسلام اور مسلمان دونوں کے حق میں سخت مضر ہونا ثابت کر دیا۔ پھر مسلمانوں کی قومی سیاست پر مدلل تنقید کی اور اسلام کے بلند ترین تصوریت پسندانہ موقف کے مقابل سے اس کا 'خلاف اسلام' ہونا ثابت کیا اور خود اسی بلند ترین تصوریت پسندانہ سطح (HIGHEST IDEALISTIC LEVEL) پر اپنی جماعت کی اساس رکھ دی۔

چنانچہ جماعت اسلامی کے اساسی موقف کا خلاصہ یہ قرار پایا کہ:

۱۔ اسلام مذہب نہیں دین ہے اور اس کی اصل حیثیت ایک کامل نظریہ حیات اور مکمل نظام زندگی کی ہے جو اپنی عین فطرت کے تقاضے کے طور پر اپنا کلی نفاذ اور کامل غلبہ چاہتا ہے۔

۲۔ عبادت صرف مراسم عبودیت کا نام نہیں بلکہ اس نظام کی کلی اطاعت کا نام ہے۔

۳۔ مسلمان قوم نہیں امت مسلمہ اور حزب اللہ ہیں اور ان کی اصل حیثیت ایک نظریاتی جماعت (IDEOLOGICAL PARTY) کی ہے جس کا اولیں مقصد اپنے نظریات کے مطابق انقلاب

برپا کرنا اور اپنے نظامِ زندگی کو بالفعل قائم کرنا ہے۔

۴۔ دنیا کے موجودہ غیر مسلموں کی ایک عظیم اکثریت قانوناً تو کافر ہے لیکن حقیقتاً کافر نہیں۔ اس لئے کہ ان کے سامنے اسلام کی دعوت پیش ہی نہیں کی گئی کہ ان کے انکار یا ردّ کر دینے کا سوال پیدا ہو۔

۵۔ اسی طرح دنیا کے موجودہ مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت بھی صرف قانونی اور نسلی، مسلمانوں پر مشتمل ہے نہ کہ حقیقی مسلمانوں پر۔ اس لئے کہ نہ ان کے قلوب و اذہان میں اسلام کی نظریاتی و اعتقادی اساسات راسخ ہیں نہ ان کے عمل میں اسلامی قانون کی پابندی اور شریعت کا التزام ہی پایا جاتا ہے۔

۶۔ مسلمانوں کے قومی مفادات کے تحفظ اور ان کے سیاسی حقوق کی حفاظت یا ان کی آزادی اور خود اختیاری کے حصول کی جد و جہد کا اسلام کی نشاۃ ثانیہ یا احیائے دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

۷۔ "کرنے کا اصل کام" یہ ہے کہ اوّلاً —— بلا لحاظ مذہب و ملت پوری نوعِ انسانی کو بندگیٔ رب کی طرف پکارا جائے اور اسلام کی نظریاتی اساسات کو شعوری طور پر قبول کرنے کی دعوت دی جائے اور —— پھر[۲] سابق غیر مسلموں یا نسلی مسلمانوں میں سے جنہیں بھی اللہ تعالیٰ اسلام کو شعوری طور پر قبول کرنے کی توفیق عطا فرما دے، ان کی قوتوں کو ایک ہیئت تنظیمی کے تحت مجتمع کر کے غلبۂ دینِ حق یا "حکومتِ الٰہیہ"[۱] کے قیام کی منظّم جد و جہد کی جائے!

۸۔ اس جد و جہد میں اوّلین اہمیت علمی و فکری انقلاب کو حاصل ہے۔ پھر عملی و اخلاقی تبدیلی اور معاشرتی اصلاح کو۔ نظامِ حکومت کی تبدیلی کا مرحلہ ان سب کے بعد آتا ہے۔

ہمارے نزدیک اس موقف میں انتہا پسندی کی شدت تو موجود ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا ٹھیٹھ نظریاتی اور اصولی موقف یہی ہے اور دوسری احیائی مساعی کے ساتھ ساتھ اس خالص اصولی اساس پر کسی تحریک کا اٹھنا وقت کی ایک اہم ضرورت تھی جو مولانا سیّد ابو الاعلیٰ مودودی کے ہاتھوں پوری ہوئی اور ہم داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے اس پر کہ مولانا موصوف اور ان کے رفقائے کار حالات کی سخت نامساعدت کے علی الرغم اور ہر طرح کے طعن و طنز اور تمسخر و استہزاء کے باوجود مسلسل چھ سال اس موقف پر ڈٹے رہے۔ نتیجۃً عزیمت کی نہایت اعلیٰ مثالیں چشمِ فلک نے دیکھیں اور "تاریخ دعوت و عزیمت" میں ایک نہایت درخشاں باب کا اضافہ ہو گیا۔ اس طرح

---

[۱] واضح رہے کہ جب جماعت اسلامی کے قیام پر مولانا امین احسن اصلاحی کا قرآنی ذہن بھی اس تحریک کے ساتھ آ شامل ہوا تو "حکومتِ الٰہیہ" کی اصطلاح سرے سے متروک ہو گئی اور اس کی جگہ "شہادتِ حق" اور "اقامتِ دین" کی خالص قرآنی اصطلاحوں نے لے لی!

وہ کام جسے احیائے اسلام کے "راست اقدام" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جس کا ابتدائی خاکہ (BLUE-PRINT) مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے تیار کیا تھا عملاً مولانا مودودی کے ہاتھوں شروع ہوا۔

لیکن افسوس کہ ع "خوش درخشید و لے شعلۂ مستعجل بود!" کے مصداق مولانا مودودی اور جماعت اسلامی اس بلند و بالا موقف پر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکے اور ۴۷ء میں جیسے ہی مسلمانان ہند کی قومی تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور پاکستان کے نام سے ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہوئی اور متعدد اسباب سے ایک توقع سی نظر آئی کہ یہاں اسلام کے نام پر ایک سیاسی تحریک چلائی جا سکتی ہے۔ انہوں نے اپنے اصولی موقف کو ترک کر کے بغیر اس کے کہ کوئی علمی و فکری انقلاب آیا ہو یا اخلاقی و عملی تبدیلی معاشرے میں برپا ہوئی ہو "نظام حکومت کی اصلاح" کے لئے عملی سیاسیات کے میدان میں قدم رکھ دیا ———— لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ توقع تو موہوم سے موہوم تر ہوتی چلی گئی البتہ سیاست کی سنگلاخ وادی میں یہ تحریک "وَلٰکِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَی الْاَرْضِ"[۱] کے مصداق پست سے پست تر موقف اختیار کرنے پر مجبور ہوتی چلی گئی۔

پہلے خیال تھا کہ خالص اسلام کے نام اور محض اپنے زور بازو کے بل پر یہ مرحلہ سر ہو جائے گا لہٰذا کمال شان استغنا کے ساتھ دوسری سیاسی جماعتوں کی اشتراک عمل کی پیش کشوں کو ٹھکرا دیا گیا۔ جب پنجاب کے ۵۱ء کے الیکشن کے بعد یہ مغالطہ دور ہوا تو خیال ہوا کہ مذہب کے نام پر دوسری مذہبی جماعتوں کے تعاون سے یہ مہم سر کی جائے۔ پھر جب معلوم ہوا کہ یہ بھی ممکن نہیں اور چڑھائی اتنی سخت ہے کہ گاڑی اس سیکنڈ گیئر میں بھی آگے نہیں بڑھ سکتی تو گویا ٹاپ گیئر آزمایا گیا اور ایک درجہ اور نیچے اتر کر محض جمہوریت کے نام پر مذہبی و لادینی تمام عناصر کے ساتھ مل کر آگے بڑھنے کی کوشش کی گئی۔ سابق صدر ایوب مرحوم کا پورا گیارہ سالہ دور حکومت اسی "بحالی جمہوریت" کی مہم کی نذر ہو گیا۔ لیکن جب ان کے اقتدار کی عمارت گری تو اس کے ملبے سے کچھ "اور" ہی برآمد ہو گیا!

ہمارے پیش نظر اس وقت نہ تو تاریخ نگاری ہی ہے نہ جماعت اسلامی کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی یا قیاس آرائی! نہ ہم اس وقت اس بحث ہی میں الجھنا چاہتے ہیں کہ مولانا مودودی کے اس "انقلاب حال" کے اسباب کیا تھے (اس پر ہم اپنی تالیف "تحریک جماعت اسلامی:

---

[۱] "سورۂ اعراف آیت ۱۷۶: لیکن وہ تو زمین ہی میں دھنس کر رہ گیا!"

ایک تحقیقی مطالعہ" میں مفصل بحث بھی کر چکے ہیں، ہمیں اس معاملے کے جس پہلو سے اصل دلچسپی ہے وہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے اس "انتقالِ موقف" سے احیائے اسلام کے ہمہ جہتی عمل میں جو خلا اصولی اسلامی تحریک کی جگہ پھر خالی ہو گئی اور اس مہیب خلا کو پُر کرنے کی کوئی صورت تا حال پیدا نہیں ہوئی جو اپنے پیش رو مولانا آزاد اور ان کی جماعت حزب اللہ کی طرح مولانا مودودی اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی نے جیتے جی مرحوم ہو کر پیدا کیا ہے چنانچہ اگرچہ سیاسی و قومی سطح پر بھی احیائی عمل جاری ہے اور علماء کرام کی سرگرمیاں بھی اپنے اپنے رنگ میں تیز سے تیز تر ہو گئی ہیں، احیائی عمل کا یہ تیسرا اور اہم ترین گوشہ ویران و سنسان پڑا ہے!

جماعت اسلامی کے موقف میں یہ تبدیلی اصولاً ۱۹۴۷ء ہی میں پیدا ہو گئی تھی لیکن کم و بیش دس سال یہ اپنی پہلی قوت کے زور میں بڑھتی چلی گئی اور اس تبدیلی کا احساس بھی لوگوں کو نہیں ہوا۔ لیکن ۱۹۵۷-۵۸ء میں جماعت میں اس احساس نے زور پکڑا اور طریق کار کے بارے میں ایک اختلافی رائے ظاہر ہوا جس نے ایک ہنگامے کی صورت اختیار کر لی۔ نتیجتہً جماعت کے "اکابر" کی اکثریت چند "اصاغر" سمیت جماعت سے کٹ گئی۔ ان "اصاغر" میں سے ایک ان سطور کا راقم بھی ہے۔ بعد ازاں "بڑے" تو اپنے اپنے "بڑے" کاموں میں مشغول و مصروف ہو گئے لیکن یہ "چھوٹا" ؎

"ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنّم اب تک! اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم ایسا تک!"

کے مصداق اپنے دل و دماغ کو اس جنتِ گم گشتہ کے خیال سے فارغ نہ کر سکا بلکہ جیسے جیسے دن بیتے اس کا حال یہ ہوتا چلا گیا کہ ؎

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکت غم سے یہ الفت اور محکم ہو گئی!

وہ جب جماعت سے علیحدہ ہوا اس کی عمر کل پچیس برس تھی[1] بالکل نوعمری کا عالم، نہ علم نہ تجربہ، لہٰذا پورے دس برس اس نے اس انتظار میں بسر کئے کہ "بڑوں" میں سے کوئی ہمت کرے اور از سرِ نو سفر کا آغاز کر دے لیکن اللہ کو یہ بھی منظور نہ ہوا تا آنکہ ۱۹۶۶-۶۷ء میں اس نے

---

[1] اتفاقاً اس کی پیدائش کا وقت لگ بھگ وہ تھا جب مولانا مودودی نے "ترجمان القرآن" کی ادارت سنبھالی اور مولانا مودودی سے اس کی راہ کی علیحدگی کا زمانہ لگ بھگ وہ تھا جب مولانا آزاد نے اس دنیا سے رحلت اختیار کی!

خود کو ہمت کسی اور بفحوائے الفاظ قرآنی " اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ "[1] درس قرآن کی صورت میں خالصتہً اسلامی دعوت کے لئے ذہنی و فکری سطح پر میدان ہموار کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اس کے کام کو اللہ تعالیٰ نے شرف قبول عطا فرمایا اور چند ہی سالوں میں اس کے قائم کردہ " حلقہ ہائے مطالعہ قرآن " کی کوکھ سے " مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور " برآمد ہو گئی اور اب اس کے بھی دو ہی سال بعد وہ اسی خالصتہً اصولی اسلامی تحریک کے احیاء کے لئے " تنظیم اسلامی " کے قیام کا ارادہ کر رہا ہے !

اسے خوب معلوم ہے کہ اس کے پاس نہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی سی عبقریت اور ذہانت و فطانت ہے، نہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی سی صلاحیتِ کار اور محنت و مشقت کا مادّہ۔ پھر نہ وہ شعلہ بیان خطیب ہے نہ صاحب طرز ادیب، بایں ہمہ ایک احساس فرض ہے جو چین نہیں لینے دیتا اور ایک عظیم تحریک کی امانت کے بار کا احساس گراں ہے جس نے اسے ؎

" ہرچہ بادا باد، ماکشتی درآب انداختیم ! "

کے مصداق اس پُر خطر وادی میں کود پڑنے پر مجبور کر دیا ہے !

اسی فیصلے کے تحت اس بار ان صفحات میں بھی اس قدر طول کلام اختیار کیا گیا ہے، تاکہ راقم کا ذہن قارئین پر بالکل واضح ہو جائے۔ مزید برآں اس شمارے میں اُس تقریر کا بقیہ حصّہ

---

[1] " یقیناً یہی قرآن ہے جو رہنمائی فرماتا ہے اس راہ کی طرف جو سب سے سیدھی اور سب سے درست ہے ! " عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ یہ الفاظ مبارکہ سورۃ بنی اسرائیل میں ان آیات کے فوراً بعد وارد ہوئے ہیں جو بنی اسرائیل اور اُمت مسلمہ کی تاریخ میں مماثلت و مشابہت کے بیان میں اس تحریر میں تفصیل کے ساتھ زیر بحث آ چکی ہیں۔ مزید غور طلب نکتہ ہے یہ کہ بنی اسرائیل کی تاریخ کا ذکر شروع ہوا توراۃ کے ذکر سے " وَاٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ ھُدًی لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ " اور اس کا اختتام ہوا قرآن کے ذکر پر۔ گویا سابق اُمت کی تاسیس بھی کتاب ہی کی بنیاد پر ہوئی تھی اور اس کے معزول کئے جانے کے بعد نئی اُمت مسلمہ کی تاسیس بھی " اَلْکِتٰب " ہی کی بنیاد پر ہوئی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی " تجدید " کے لئے بھی مبنیٰ و اساس قرآن کے سوا اور کوئی چیز نہیں بن سکتی ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن　　(اقبالؔ)

بھی مزید اضافوں کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے جو ۱۲ جولائی کی شام کو لاہور میں منعقدہ اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر کی گئی تھی اور اواخر ۶۷ھ میں رحیم یار خاں میں منعقدہ ایک اجتماع کی مفصل رُوداد بھی شائع کی جا رہی ہے جس میں ' تنظیم اسلامی کی وہ تجویز قبول کی گئی تھی جو بعد میں بعض اسباب کی بنا پر تکمیل کا جامہ نہ پہن پائی اور اسی زمانے کی راقم کی ایک تقریر بھی شائع کی جا رہی ہے جس میں " دعوت الی اللہ " کی اہمیت اور اس کے اصول و مبادی پر قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں بحث کی گئی ہے گویا راقم نے اپنا ذہن کھول کر سامنے رکھ دیا ہے !

اب جو لوگ شخصیتوں اور جماعتوں کی سطح سے بلند نہ ہو کر سوچنے اور غور و فکر کرنے کی ہمت اور صلاحیت ہی سے عاری ہوں ان کا معاملہ تو دوسرا ہے البتہ وہ لوگ جو کسی تحریک کے بنیادی نظریات و مقاصد پر نظر رکھتے ہوئے اپنے موقف پر نظرِ ثانی کی ہمت کر سکیں ان کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ انہیں چاہیئے کہ ٹھنڈے دل کے ساتھ ہمارے موقف پر غور کریں۔ اور اگر انہیں اس میں صحت و صداقت نظر آئے تو ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوں اور کمر ہمت کسیں !

جہاں تک ' تنظیم اسلامی ' کے تنظیمی ڈھانچے کا تعلق ہے ابھی ہم نے اس سے تعرض نہیں کیا اگرچہ اس مسئلے پر ہمارا ذہن کم از کم قارئین ' میثاق ' پر پہلے سے ہی واضح ہے اور اس کی کسی قدر وضاحت اس تقریر میں بھی موجود ہے جو اسی شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ مزید برآں اس شمارے میں ضمیمے کے طور پر " مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور " کی جو قرارداد تاسیس شائع کی جا رہی ہے اس میں بھی اس کے اساسی خاکے (BLUE PRINT) کے بارے میں ہمارا تصور اجمالاً موجود ہے۔ تاہم اس مسئلے پر ابھی راقم خود بھی مزید غور و فکر کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے فی الحال بحث کو صرف تنظیم اسلامی کے مقاصد و طریق کار تک محدود رکھا گیا ہے۔ جو لوگ ان سے متفق ہوں تفصیلی تنظیمی ڈھانچوں کے بارے میں ان کے مشوروں سے بھی ضرور استفادہ کیا جائے گا۔

راقم الحروف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس بار پھر حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔ اگر عمر نے وفا کی تو واپسی وسط جنوری ۷۵ء تک متوقع ہے۔ اس کے فوراً بعد انشاء العزیز زیادہ سے زیادہ وسط فروری ۷۵ء تک ایک اجتماع ان لوگوں کا بلایا جائے گا جو اس بنیادی مقصد سے اتفاق رکھتے ہوں اور اسی میں بقیہ ضروری مراحل طے کر کے اللہ نے چاہا تو سفر کا آغاز کر دیا جائے گا۔ الغرض

دریں دریائے بے پایاں، دریں طوفان موج افزا سر افگندیم، بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا !

ضمیمہ

قرارداد تاسیس و اغراض و مقاصد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

چونکہ ہمیں اس امر کا شدید احساس ہے کہ

اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور غلبۂ دین حق کے دور ثانی

کا خواب

اُمّتِ مسلمہ میں تجدید ایمان کی عمومی تحریک

کے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اور

اس کے لیے لازم ہے کہ اوّلاً

منبعِ ایمان و یقین یعنی قرآن حکیم کے علم و حکمت

کی وسیع پیمانے پر تشہیر و اشاعت

کا اہتمام کیا جائے

اور چونکہ اس ضمن میں ہمیں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خیالات سے کامل اتفاق ہے

اور

ہم اس کام کو بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں جو وہ گذشتہ ساڑھے چار سال سے کر رہے ہیں

لہٰذا

ہم چند خادمانِ کتابِ مبین،

مرکزی "انجمنِ خدام القرآن" لاہور

کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں

جو

ڈاکٹر صاحب موصوف کی رہنمائی میں مندرجہ ذیل مقاصد کے لیے کوشاں رہے گی

۱— ☀ عربی زبان کی تعلیم و ترویج

۲— ☀ قرآن مجید کے مطالعے کی عام ترغیب و تشویق

۳— ☀ علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت

۴— ☀ ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم و تربیت جو تعلیم و تعلّم قرآن کو مقصدِ زندگی بنالیں

اور

۵— ☀ ایک ایسی "قرآن اکیڈمی" کا قیام جو قرآنِ حکیم کے فلسفہ و حکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کرسکے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان مقاصد کے لئے بیش از بیش کوشش اور ایثار کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

ہم ہیں :-

مؤسسینِ مرکزی "انجمنِ خدام القرآن لاہور" :———

(انجمن ۱۷ نومبر ۷۲ء کو باقاعدہ رجسٹر ہوئی)

عَنِ الْحَارِثِ الْاَشْعَرِیِّ

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

قَال : قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلّم

"اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ :

بِالْجَمَاعَۃِ

وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ

وَالْھِجْرَۃِ

وَالْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ"

(مشکوٰۃ المصابیح : بحوالہ مسند احمدؒ و جامع ترمذی)

حضرت حارث الاشعری (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا :

"میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں :

جماعت، سمع و طاعت، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سرافگندیم!

بسم اللہ مجرٖھا و مرسٰھا

اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

(۲)

[گذشتہ اشاعت میں راقم کی جو تقریر کچھ اضافوں اور توضیحی ضمیموں کے ساتھ شائع کی گئی تھی اس کا بقیہ حصہ درج ذیل کیا جا رہا ہے۔ بہتر ہو گا کہ اس کو پڑھنے سے پہلے گذشتہ شمارے سے اس تقریر کا پہلا حصہ دوبارہ نظر سے گزار لیا جائے۔ —— اسرار احمد]

دین کی اس چھوٹی سی خدمت کا آغاز، جس نے بعد میں 'دعوت رجوع الی القرآن' اور 'تحریک تعلیم و تعلم قرآن' کی شکل اختیار کر لی، میں نے اوائل ۶۸ء میں بالکل تن تنہا کیا تھا اور اس میں مجھے سوائے مولانا امین احسن اصلاحی کی دعا اور آشیرواد کے کسی پرانے بزرگ یا رفیق کا تعاون حاصل نہیں تھا بلکہ ان میں سے کچھ حضرات کی جانب سے تو مجھے باقاعدہ مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا جو بعض کی طرف سے تو علانیہ اور کھلم کھلا تھی اور بعض کی طرف سے خفیہ اور در پردہ —— اور یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا فضل و کرم ہے کہ میں ان سے دل برداشتہ نہیں ہوا بلکہ کامل یکسوئی کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہا۔

تاہم یہ واقعہ ہے کہ ابتدا میں مجھے محنت بہت شدید کرنی پڑی۔ چنانچہ ایک طرف مطب اور اس کی ذمہ داریاں، دوسری طرف درس ہائے قرآن اور خطاباتِ عام، تیسری طرف ماہنامہ 'میثاق' کی ادارت اور اس کا اہتمام و انتظام[1]، اور چوتھی طرف دارالاشاعت اور اس کی گوناگوں مصروفیات، الغرض بالکل مختلف بلکہ متضاد النوع مصروفیات کی کشاکش کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو ہی سال کی مدت میں صحت

---

[1] اب غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ۶۹ء کے دوران 'میثاق' ہر ماہ اسی صفحات پر مشتمل شائع ہوتا رہا تھا۔

نے جواب دے دیا اور مستقل حرارت رہنے لگی جو شام کے وقت باقاعدہ بخار کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔

ابتدا میں میں نے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی پھر مجبوراً تشخیص کی طرف توجہ کرنی پڑی لیکن بہت سی تحقیق و تفتیش سے جب کوئی حتمی نتیجہ بر آمد نہ ہوا تو طے پایا کہ آرام کیا جائے، چنانچہ دو تین ہفتوں کے لئے لاہور سے باہر جا کر آرام کیا، لیکن واپس آ کر دوبارہ کام شروع کیا تو پھر وہی صورت پیدا ہو گئی، بالآخر کچھ اسی بددلی کے باعث اور کچھ بعض دوسرے اسباب کی بنا پر میں نے طے کیا کہ چار چھ ماہ ملک سے باہر بسر کئے جائیں۔ اب ظاہر ہے کہ بیرونِ ملک ارضِ مقدس سے بہتر جگہ اور کون سی ہو سکتی تھی چنانچہ اواخر اکتوبر ۷۰ء میں میں عازم حجاز ہو گیا۔

رمضان المبارک ۱۳۹۰ھ میں نے پورا مدینہ منورہ میں مولانا عبدالغفار حسن صاحب کی معیت میں بسر کیا۔ اس کے بعد میں ایک ماہ کے لئے برادرِ عزیز ڈاکٹر ابصار احمد سلمہٗ کی دعوت پر لندن چلا گیا وہاں سے واپس پھر حجاز آیا اور فروری ۷۱ء میں جامی کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

مشرف گرچہ شد جامی ز لطفش
خدایا آں کرم بارے دگر کن!

حج بیت اللہ سے دوسری بار مشرف ہوا۔

اس پورے عرصے کے دوران میں میں مسلسل آئندہ کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچتا رہا اور بالآخر سرزمین حجاز میں حج ہی کے مبارک موقع پر میں نے اپنی زندگی کا اہم فیصلہ کر لیا ـــــ یعنی یہ کہ آئندہ مطب کا سلسلہ بالکل بند، اور جو بھی تھوڑی بہت پونجی قوت اور صلاحیت کی حاصل ہے اور جتنی بھی مہلت عمر باقی ہے سب کی سب وقف برائے خدمتِ کتاب اللہ و سعی اعلاءِ کلمۃ اللہ!

نتیجۃً مارچ ۷۱ء میں ارضِ مقدس سے واپسی پر جب بالکل یکسو ہو کر ازسرِ نو کام کا آغاز کیا تو چند ہی ماہ میں اس نے اتنی وسعت اختیار کر لی کہ ایک تنظیمی ڈھانچے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

اس ضرورت کے احساس کو کچھ تقویت اس سے بھی حاصل ہوئی کہ اس وقت تک طباعت و اشاعت کا سارا کام میرے ایک ذاتی ملکیتی ادارے کے تحت ہو رہا تھا اور اگرچہ اس میں یافت کچھ بھی نہ تھی تاہم لوگوں کو ان مطبوعات کی اشاعت کی ترغیب دلانے میں مجھے خود بھی حجاب محسوس ہوتا تھا، اور بعض بزرگوں نے بھی توجہ دلائی کہ یہ بات کچھ اچھی نہیں لگتی!

چنانچہ خیال آیا کہ کوئی ادارہ قائم کیا جائے اور طباعت و اشاعت کا سارا سلسلہ اس کے حوالے کر دیا

جائے تاکہ دوسرے مصنفین کی کتابوں کی اشاعت سے بھی اگر کچھ بچت ہو تو وہ کسی فرد کی کمائی نہ بنے بلکہ ادارے کی ملکیت ہو۔ رہی میری تحریریں تو ان پر تو نہ کوئی منفعت ادارہ حاصل کرے نہ میں ہی کوئی حق تالیف وصول کروں تاکہ میں پورے انشراح صدر کے ساتھ کہہ سکوں کہ میرا کوئی مفاد ان کے ساتھ وابستہ نہیں ہے اس لئے کہ اس پورے کام کو محض رسماً تو کرنا مقصود نہیں تھا اصل پیش نظر تو یہ تھا کہ یہ ایک صحیح اسلامی دعوت کی تمہید بنے اور دعوت حق کے مزاج سے اس چیز کو کوئی ادنیٰ مناسبت بھی حاصل نہیں کہ داعی اپنی دعوتی تحریروں کی رائلٹی کو اپنی معاش کا ذریعہ بنائے۔ "داعی الی اللہ" کا مقام اور مرتبہ تو بہت ہی بلند ہے اور اس کے لئے تو لازم ہے کہ واضح طور پر یہ کہہ سکے کہ "وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝" دین کی کسی ادنیٰ خدمت میں بھی کوئی شخص کسی ادارے یا جماعت سے ایک معین مشاہرہ بقدر کفاف لے لے تو اس کی گنجائش تو نکل سکتی ہے لیکن کسی دینی خدمت کے ضمن میں تحریر یا تقریر کو ذریعہ معاش بنانا تو کسی درجے میں بھی مناسب نہیں چنانچہ ماضی قریب تک ہمارے بزرگوں کا دستور یہ رہا ہے کہ سارا دن مختلف اداروں یا دارالعلوموں میں نہایت قلیل مگر معین مشاہروں پر گزارہ کرتے ہوئے بسر کر دی اور اس پورے عرصے کے دوران میں جو کچھ لکھا اسے ہوا اور پانی کی طرح مباح کر دیا کہ جو شخص چاہے شائع کرے۔ اپنا کوئی حق تصنیف اس پر نہیں رکھا ——— میں اگرچہ ذاتی طور پر تو پہلے ہی سے اس طریق پر عمل پیرا ہو چکا تھا چنانچہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کا پہلا ایڈیشن اگرچہ شائع تو "دارالاشاعت الاسلامیہ" کے تحت ہوا تھا لیکن اس پر لکھ دیا گیا تھا کہ "اس کتابچے کی طباعت و اشاعت کی ہر شخص کو کھلی اجازت ہے[1]!" تاہم اب ضرورت محسوس ہوئی کہ پورے سلسلہ اشاعت کو ایک نظام کے تحت لے آیا جائے۔

بہرحال، ان گوناگوں اسباب سے ایک ہیئت تنظیمی کی ضرورت محسوس ہوئی اور چونکہ یہ بات بالکل واضح تھی کہ "سمع و طاعۃ" کے خطیرہ اسلامی اصول پر مبنی نظم جماعت کا قیام ابھی بہت

---

[1] اس کتابچے کا انگریزی ترجمہ بھی پروفیسر محمد ابراہیم مرحوم و مغفور نے بالکل بلا معاوضہ کیا اور جب وہ طبع ہوا تو اس پر بھی تصریح کر دی گئی کہ اس پر کسی فرد یا ادارے کا کوئی حق "محفوظ" نہیں ہے۔ جو چاہے شائع کرے۔ اب اس کا عربی ترجمہ بھی برادرم صہیب حسن نے بالکل بے مزد کیا ہے اور اگر اس کی بھی کتابی صورت میں اشاعت کی نوبت آئی تو انشاء اللہ یہی تصریح کر دی جائے گی!

قبل از وقت تھا لہٰذا ذہن ایک انجمن کی تشکیل کی جانب منتقل ہوا کہ SERVANTS OF THE BIBLE SOCIETY کے طرز پر "انجمن خدّام القرآن" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جائے۔

اب جو غور کیا تو محسوس ہوا کہ تنظیمی اعتبار سے 'انجمن' "اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ" کا کامل مصداق ہوتی ہے اور عام طور پر اس کے قواعد و ضوابط کا جو ڈھانچہ بنایا جاتا ہے اس کی بنا پر وہ موم کی ناک بن کر رہ جاتی ہے کہ جدھر چاہے موڑ لی جائے بلکہ بسا اوقات انجمنیں اپنے مؤسسین کے مقصد و منشا کے بالکل خلاف رُخ پر چل پڑتی ہیں اور ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ وہ مؤسس یا مؤسسین جنہوں نے کسی انجمن کی تاسیس اور داغ بیل ڈالنے میں خون پسینہ ایک کیا ہوتا ہے اس سے اس طرح نکال دیئے جاتے ہیں جیسے دودھ سے مکھی۔

دوسری طرف ایک عرصہ تک غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا اور مجھ پر یہ بات شدت کے ساتھ منکشف ہو چکی تھی کہ اسلام کا تنظیمی مزاج نہ صرف یہ کہ دورِ جدید کی جماعت سازی کے طریقوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا بلکہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ عہدِ حاضر میں کسی بھی ہیئت تنظیمی کی اصل اساس اس کے 'دستور اور قواعد و ضوابط' ہوتے ہیں جن سے عہدِ وفاداری استوار کر کے لوگ اس ہیئت تنظیمی میں شریک ہوتے ہیں۔ پھر یہ لوگ اپنے میں سے کثرتِ رائے سے اپنا ایک صدر چنتے ہیں جسے صرف ایک آئینی سربراہ کی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور جس کا انتخاب محض ایک معینہ مدّت کے لئے ہوتا ہے۔ پھر اس صدر اور عام اراکین کے مابین ایک اور ادارہ مجلس منتظمہ یا مجلس عاملہ وغیرہ ناموں سے قائم کیا جاتا ہے جس کی اصل غرض اس صدر کی 'نگرانی' ہوتی ہے۔ آگے اس صدر اور مجلس عاملہ یا منتظمہ کے مابین حقوق و اختیارات کی تقسیم کے مختلف طریقوں کی بنیاد پر صدارتی یا پارلیمانی طرز ہائے جماعت وجود میں آتے ہیں لیکن ان سب میں یہ امر بطور قدرِ مشترک موجود ہوتا ہے کہ تنظیمی ڈھانچہ نیچے سے اوپر کی طرف بڑھتا ہے۔ یعنی اس میں اصل حیثیت بنیادی رکنیت (PRIMARY MEMBERSHIP) کو حاصل ہوتی ہے نہ کہ صدر یا سربراہ کو!

اس کے برعکس اسلام کا تنظیمی ڈھانچہ اوپر سے نیچے کی طرف بڑھتا ہے یعنی کوئی شخص معیّن جسے اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرماتا ہے دین کی کسی خدمت کے داعیے سے سرشار ہو کر اٹھتا ہے اور لوگوں کو پکارتا ہے کہ "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ" کون ہے جو اللہ کے دین کی اس خدمت میں میرا دست و بازو بننے کے لئے تیار ہو؟ اور جنہیں اللہ توفیق دیتا ہے وہ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ

شخص معین آپ سے آپ ان کا سربراہ بن جاتا ہے اور اسے کسی کے ووٹوں سے "منتخب" ہونے کی ہرگز کوئی حاجت نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ وہ محض ایک دستوری اور آئینی سربراہ نہیں ہوتا بلکہ "امیر" یعنی "صاحب امر" ہوتا ہے اور رہنمائی کی اصل ذمہ داری اسی کے کاندھوں پر ہوتی ہے وہ اپنے رفقاء سے مشورہ ضرور کرتا ہے لیکن اپنی ضرورت کے احساس کے تحت نہ کہ ان کا حق ادا کرنے کی خاطر ——— یہ ایک ایسا فطری نظم جماعت ہے جس میں قواعد و ضوابط اور دخول و خروج کے لیے چوڑے قوانین وضع کرنے کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔ جس شخص کو جس قدر اتفاق اس دعوت کے ساتھ اور جتنا اعتماد اس داعی کی ذات پر ہوتا ہے اتنا ہی وہ اس کے ساتھ تعاون کرتا ہے اور جب اور جتنی کمی ان دونوں چیزوں میں واقع ہو جائے اسی مناسبت سے دوری اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ جنہیں اس کے ساتھ کامل اتفاق اور اس پر پورا اعتماد ہو جاتا ہے وہ اس کے ہاتھ پر "بیعت" کر کے اس کے ساتھ سمع و طاعت کے ایک شخصی رابطے میں منسلک ہو جاتے ہیں اور اسی کو اس ہیئت تنظیمی کے اصل مرکز (NUCLEUS) کی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے!

بنا بریں میں نے یہ طے کیا کہ اگرچہ ابھی سمع و طاعت کے اصول پر مبنی ایک ٹھیٹھ اسلامی نظم جماعت کے قیام کا وقت تو نہیں آیا اور سر دست صرف ایک انجمن ہی قائم کی جائے جس کے تحت اس "دعوت رجوع الی القرآن" اور "تحریک تعلیم و تفہم قرآن" کے کم از کم ان جملہ امور کو منضبط کر لیا جائے جن کا تعلق روپے پیسے سے ہو، تاہم اس کا تنظیمی ڈھانچہ عام انجمنوں کی طرز پر نہ ہو جس کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنے ظریفانہ کلام میں بہت خوب کہا ہے کہ:

الیکشن، ممبری، کرسی، صدارت بنائے خوب آزادی نے پھندے
اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

بلکہ اسی فطری طرز پر ہو جس کی وضاحت میں کر چکا ہوں اور چونکہ مجھے اس پر پورا انشراح صدر حاصل تھا لہٰذا میں نے اسے ہرگز مخفی نہیں رکھا بلکہ اواخر ۷۲ء ہی میں جبکہ ایک انجمن کے قیام کی تجویز ابتدائی مراحل میں تھی، میں نے متعدد بار مسجد خضراء میں درس قرآن کے بعد اپنا ذہن کھول کر حاضرین کے سامنے رکھ دیا اور پھر جولائی ۷۳ء کے "میثاق" میں "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کے مجوزہ خاکے کے ساتھ بھی میں نے "تذکرہ و تبصرہ" کے صفحات میں اپنا نقطہ نظر پوری وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا۔

اس کا نتیجہ بھی وہی ہوا جس کی اس "جمہوریت نواز" بلکہ "جمہوریت پرست" دور میں مجھے پہلے سے توقع تھی، چنانچہ مذاق بھی اڑایا گیا اور پھبتیاں بھی کسی گئیں لیکن الحمد للہ و المنۃ کہ لاہور میں جن لوگوں نے اس کام میں میرے ساتھ تعاون کا بیڑا اُٹھایا تھا ان میں سے کسی ایک نے بھی اختلاف نہیں کیا اور بالآخر اواخر ۱۹۷۲ء میں "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" انہی اصولوں پر بالفعل قائم ہو گئی اور اس طرح یہ چھوٹی سی اسلامی تحریک اپنے پہلے تنظیمی مرحلے میں داخل ہو گئی۔

اس مرحلے پر عام لوگوں کے استہزا کی تو میں نے کوئی پرواہ نہ کی لیکن بعض بزرگوں کا شدید اختلاف میرے لئے بڑی آزمائش بن گیا۔ ان حضرات کی خدمت میں میں نے بصد ادب عرض کیا کہ دلائل سے میری رائے تبدیل ہو جائے تو میں یقیناً رجوع کر لوں گا۔ لیکن محض لحاظ بزرگی کے باعث یا صرف پاسِ ادب کے طور پر میں اپنا قدم واپس نہیں لے سکتا اس سے کچھ تلخیاں بھی ہوئیں اور بعض معاملات میں کچھ RE-ADJUSTMENTS بھی کرنی پڑیں لیکن بحمد اللہ کام رکا نہیں بلکہ قافلہ رواں ہی رہا۔

"انجمن خدام القرآن" کی دو سال سے بھی کم مدت کی کارگزاری چاہے بہت حوصلہ افزا نہ ہو، بحمد للہ مایوس کن یا حوصلہ شکن بھی نہیں ہے چنانچہ ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ سرمایہ فراہم ہوا جس میں سے قریباً ایک لاکھ کے صرف سے یونیورسٹی کیمپس کے نواح میں مجوزہ قرآن اکیڈمی کے لئے ایک قطعہ زمین[1] خرید لیا گیا اور ایک لاکھ سے کچھ زائد کی INVESTMENT سے "مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کا قیام عمل میں آیا جس نے نہایت قلیل مدت میں ایک طرف تدبر قرآن کی جلد سوم اور مجموعہ تفاسیر فراہیؒ ایسی ضخیم کتب شائع کیں۔ تدبر قرآن کی جلد اوّل کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ حقیقت شرک، حقیقت توحید، حقیقت تقویٰ اور حقیقت نماز پر مشتمل حقیقت دین شائع کی اور مزید برآں مقدمہ تدبر قرآن اور تفسیر سورہ فاتحہ کا ایک نہایت سستا ایڈیشن تین ہزار کی تعداد میں شائع کیا۔ تاکہ تدبر قرآن کے اصول و منہاج (METHODOLOGY) کا

---

[1] ایک دوسرا قطعہ جو انجمن کے مؤسسین میں سے ایک صاحب نے انجمن کو ہبہ کیا ہے کیمپس سے ذرا فاصلے پر واقع ہے جسے فروخت کر دینے کا پروگرام ہے!

علم عام ہوا[ا] ——— دوسری طرف جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کا دوسرا ایڈیشن دس ہزار کی تعداد میں اور اس کا انگریزی ترجمہ دو ہزار کی تعداد میں شائع کیا۔ "اسلام کی نشأۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام" کے دو ایڈیشن شائع کئے۔ "راہ نجات : سورۃ والعصر کی روشنی میں" کا پہلا ایڈیشن چار ہزار کی تعداد میں شائع کیا اور اب مولانا فراہی رح کی "اقسام القرآن" اور "ذبیح کون ؟" کی کتابت ہو چکی ہے اور تدبر قرآن جلد چہارم کی کتابت جاری ہے۔

لاہور میں دو مقامات پر تدریس عربی کا انتظام کیا گیا جو اگرچہ لوگوں میں مستقل مزاجی کی کمی کے باعث زیادہ حوصلہ افزا تو ثابت نہیں ہوا لیکن جیسے تیسے چل رہا ہے۔

دسمبر ۷۳ء میں لاہور میں ایک عظیم الشان سہ روزہ "قرآن کانفرنس" منعقد کی گئی جس سے لوگوں میں ایک خاص خوشگوار حیرت (PLEASANT SURPRISE) کی سی کیفیت پیدا ہوئی اور جس سے کم از کم لاہور میں اس "دعوت رجوع الی القرآن" اور "تحریک تعلیم و تعلّم قرآن" کا تعارف نہایت وسیع پیمانے پر ہو گیا۔ نتیجۃً لاہور میں اس دعوت کا مرکز شہر کے ایک کونے یعنی مسجد خضراء سمن آباد سے شہر کے قلب یعنی مسجد شہداء مال روڈ میں منتقل ہو گیا۔

مزید برآں چار اہم مواقع پر لوگوں کی توجہ قرآن حکیم کی جانب منعطف کرانے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ ایک سال ایک سٹال تبلیغی جماعت کے سالانہ اجتماع کے موقع پر رائے ونڈ میں اور ایک سٹال مشہور عوامی میلے کے موقع پر لاہور میں لگایا گیا جہاں مطبوعات کی فروخت کا انتظام بھی کیا گیا اور تعارفی ہینڈبل بھی کثیر تعداد میں تقسیم کئے گئے۔ دوسری[۲] طرف لاہور میں فروری ۷۴ء میں منعقدہ اسلامی کانفرنس (ISLAMIC SUMMIT) کے موقع پر بعض مخیر حضرات کے تعاون سے اخبارات میں ایسے خوبصورت کتبے (INSERTIONS) شائع کئے گئے جن سے لوگوں کا ذہن ادھر منتقل ہو کہ اسلامی اتحاد کا انحصار "اعتصام بحبل اللہ" پر ہے اور از روئے فرمان نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ و السلام "حبل اللہ" سے مراد قرآن حکیم ہے۔ گویا بقول علامہ اقبال مرحوم

ع " اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست ! "

[ا] یہ کتاب حال ہی میں ایک رفیق کی جانب سے مسجد شہداء کے درس کے شرکاء میں مفت تقسیم کی گئی اور اس سے شرکاء کی تعداد کی پہلی بار صحیح گنتی بھی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اس اجتماع میں ساڑھے چار سو سے زائد لوگ شریک تھے ——— فللّٰہ الحمد والمنۃ

تیسرے لاہور کے اہم ثقافتی اجتماع یعنی اجلاس یوم اقبال کے موقع پر ایک نہایت خوبصورت دو ورقہ "ہدیہ یوم اقبال" تقسیم کیا گیا جس میں علامہ مرحوم کے اشعار کے حوالے سے لوگوں کی توجہ قرآن حکیم کی جانب منعطف کرانے کی کوشش کی گئی۔

عمومی نشر و اشاعت کی ان کوششوں پر مستزاد یہ ہیں انجمن کے ایک اہم رکن اور فعال کارکن کی ذاتی مساعی جن میں "قرآن کے حقوق" پر مشتمل ایک نہایت خوشنما چارٹ کی کثیر تعداد میں اشاعت اور تقسیم اور بعض دوسرے ذرائع ابلاغ سے لوگوں کو قرآن مجید کے جانب متوجہ کرنے کی کوششیں شامل ہیں۔

رہا درس ہائے قرآن اور خطابات عام کا سلسلہ جو لاہور میں جاری رہا تو اس کی تفصیل نہ ممکن ہے نہ ضروری۔ ان میں سے صرف دو چیزوں کا ذکر اور وہ بھی محض "تحدیثاً بالنعمۃ" کر رہا ہوں ایک یہ کہ اتوار کی صبح کا درس اب بحمد للہ لاہور کی دینی، علمی اور ثقافتی زندگی کا اہم اور مستقل جزو بن چکا ہے[1] اور دوسرے یہ کہ لوگوں کے ذوق و شوق کا اندازہ کرنے کے لئے خود یہ تربیتی پروگرام کافی ہے جس میں موسم کی شدت اور حالات کی نامساعدت کے علی الرغم لوگوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

بیرون لاہور ——— کراچی میں تو ایک ذیلی انجمن ہی قائم ہو گئی جس کی کارگزاری بعض پہلوؤں سے مرکزی انجمن سے بھی بہتر رہی۔ اس کے علاوہ بہت سے دوسرے مقامات کا سفر کر کے وہاں قرآن حکیم کا پیغام پہنچانے کی سعی کی گئی جس کی تفصیل طوالت کے خوف کے باعث ممکن نہیں!

قصہ مختصر یہ کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں اس عرصے میں پوری طرح مصروف رہا ہوں اور جہاں تک میرے اوقات اور میری حقیر سی قوتوں اور صلاحیتوں کا تعلق ہے ان کا پورا مصرف انجمن خدام القرآن کے تحت ہو رہا ہے اور بحمد للہ اپنی حقیر سی محنت کے نتائج سے بھی میں نہ بد دل ہوں نہ مایوس، تاہم اس پورے عرصے کے دوران میں ایک خلش میرے دل میں مسلسل موجود رہی اور یہ سوال بار بار ذہن میں ابھرتا رہا کہ کیا اس طرح میری تمام دینی ذمہ داریاں پوری ہو رہی ہیں اور میں اپنے جملہ فرائض دینی سے عہدہ برآ ہو رہا ہوں؟ اور کہیں ایسا تو نہیں کہ میں نے اپنے اصل فرائض سے پہلو تہی کرنے کی غرض سے گریز کی راہ اختیار کر لی ہو۔ اور ایک باقاعدہ جماعت کے قیام اور شہادت حق اور اقامت دین ایسے کٹھن فرائض دینی کی "تپتی راہوں" سے فرار کی خاطر ایک انجمن اور اس کے تحت صرف

---

[1] اس اجتماع کی حاضری اب، بحمد للہ پانچ صد سے متجاوز ہو چکی ہے۔ مدیر

درس و تدریس اور طباعت و اشاعت کی "ٹھنڈی چھاؤں" میں بسیرا کر لیا ہو[1]؟

میں نے اپنی سوانح کا جو پس منظر اور اپنے فکر کا جو 'شجرۂ نسب' آج تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اس کے پیش نظر اس بات کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ میں اس محدود اور جزوی کام پر پوری طرح مطمئن ہو سکتا۔ چنانچہ انجمن خدام القرآن کے مجوزّہ خاکے کی اشاعت کے ساتھ ہی جولائی ۷۲ء کے 'میثاق' میں جو تصریحات میں نے شائع کی تھیں ان میں بھی یہ الفاظ موجود ہیں کہ :

" واضح رہے کہ راقم الحروف اپنی ذہنی ساخت اور مزاج و طبع کی افتاد کے اعتبار سے محض انجمن سازی پر نہ کبھی پہلے مطمئن ہو سکا ہے اور نہ اب مطمئن ہو سکتا ہے بلکہ اس کے پیش نظر بحمد للہ اعلائے کلمۃ اللہ اور اظہار دین حق کا بلند و بالا نصب العین ہے اور اس کے لئے ایک ہمہ گیر جد و جہد ہی اس کی زندگی کا اصل مقصد ہے ـــــ پھر یہ بات بھی اس پر بخوبی واضح ہے کہ یہ کام انجمنوں کے ذریعے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے لازم ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قول مبارک کے مطابق سمع و طاعت اور جہاد و ہجرت کی بنیادوں پر باقاعدہ ایک جماعت قائم کی جائے اور اسے امید واثق ہے کہ بفضلہ تعالیٰ اس کی زندگی میں یہ مرحلہ بھی ضرور آکر رہے گا۔ تاہم ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا مناسب وقت کب آئے گا اور فی الوقت ان مقاصد عظیمہ کی اصل جد و جہد کی تمہید کے طور پر صرف تعلیم و تعلم قرآن کے جزوی کام پر اکتفا کئے ہوئے ہے اور پیش نظر انجمن کی حیثیت اس جزوی کام کے بھی ایک شعبے کی ہے۔

چنانچہ مجوزہ انجمن کی قرار داد تاسیس کے الفاظ سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ "منبع ایمان و یقین یعنی قرآن حکیم کے علم و حکمت کی وسیع پیمانے پر تشہیر و اشاعت" بجائے خود مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود یعنی " اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور غلبہ دین حق کے دور ثانی" کی شرط لازم یعنی "تجدید ایمان کی عمومی تحریک" برپا کرنے کا وسیلہ اور ذریعہ ہے[2]۔"

بایں ہمہ مجھے اپنی کمزوریوں، خامیوں اور کوتاہیوں کا شدید احساس اس راہ میں پیش قدمی سے روکے رہا۔ اس لئے کہ جیسا کہ میں پہلے تفصیل سے بیان کر چکا ہوں میرے نزدیک مدرّس اور معلّم کا مقام اور

---

[1] تپتی راہیں مجھ کو پکاریں
دامن پکڑے چھاؤں گھنیری　　(جگر مرادآبادی)

[2] ماہنامہ 'میثاق' بابت جولائی ۷۲ء صفحات ۳ و ۴

ہے" داعی کا مقام اور! [1] مدرّس یا معلّم کا کام بات سمجھا کر یا راستہ دکھا کر ختم ہو جاتا ہے جبکہ داعی کا فرض یہ ہوتا ہے کہ خود آگے بڑھے اور نہ صرف یہ کہ لوگوں کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دے بلکہ خود راہ عزیمت پہ گامزن ہو کر دوسروں کے لئے مثال اور نمونہ پیش کرے اور ظاہر ہے کہ یہ ذمّہ داری نہایت کٹھن ہے اور اس کی شرائط بہت سخت ہیں! میں نے جب بھی کبھی اپنے آپ کو ان تقاضوں کے اعتبار سے تولا تو محسوس ہوا کہ میں اس مقام کے کم از کم معیار پر بھی پورا نہیں اترتا۔ لہٰذا اپنے آپ کو اس راہ میں اقدام سے روکے رکھنے ہی میں عافیت نظر آئی۔

لیکن ادھر کچھ عرصے سے بعض باتیں ایسی سامنے آئیں جنہوں نے مجھے اپنے فیصلے پہ نظرثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔

یہ خدشہ تو، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، مجھے پہلے بھی تھا کہ کہیں میرا نفس عافیت کوشی کی خاطر مجھے گریز اور فرار کی راہیں نہ سجھا رہا ہو۔ لیکن ایک بزرگ نے یہ اندیشہ بھی پوری شدت کے ساتھ پیش کیا کہ یہ کہیں شیطان کا وسوسہ ہی نہ ہو اور ایسا نہ ہو کہ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کے اقرار اور اعترافِ تقصیر کے پردے میں دراصل وہی دشمنِ ازلی راستہ روکے کھڑا ہو اور معاملہ وہی ہو کہ ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

پھر یہ بات بھی سامنے آئی کہ معصومیت خاصۂ نبوّت ہے اور نبوّت کا دروازہ بند ہو چکا! امامت معصومہ کے قائلین کے لئے تو گنجائش ہو سکتی ہے کہ وہ حالت انتظار ہی میں رہیں لیکن دوسروں کے لئے تو ایک ہی صورت ممکن ہے اور وہ یہ کہ وہ جیسے بھی ہوں اپنی اصلاح اور تربیت کی فکر کرتے ہوئے فرائض کی انجام دہی پہ کمربستہ ہو جائیں۔ پھر یہ بات بھی چاہے کلیتہً صحیح نہ ہو، جزوی حقیقت ضرور ہے کہ کام خود بہترین مربّی ہے اور اصلاح و تربیت کے بعض تقاضے اس کے بغیر پورے ہو ہی نہیں سکتے کہ انسان اللہ کا نام لے کر کام کا آغاز کر دے اور منجدھار میں کود پڑے!

---

[1] بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلاّ کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور!

پھر یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ اگرچہ راہ نہایت پرخطر ہے اور جو غلطیاں دوسروں سے ہوئیں کوئی ضمانت نہیں کہ ویسی ہی نہیں ان سے بھی کہیں زیادہ بڑی غلطیوں کا صدور تم سے نہ ہو گا، یا جو لغزشیں یا کوتاہیاں دوسروں سے ظاہر ہوئیں تم ان سے محفوظ رہو گے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ عین ممکن ہے کہ جس طرح ماضی میں بہت سے لوگ دین کی خدمت کے داعیے کے تحت کھڑے ہوئے۔ اور "اَعطٰی قَلیلاً وَ اَکدٰی"[1] کے مصداق تھوڑے سے خیر کے ساتھ بہت سا شر پیدا کر گئے اسی طرح تم بھی کسی فتنے کی داغ بیل ڈال کر چلتے بنو —— لیکن ان خدشات و خطرات سے فرض تو ساقط نہیں ہو جاتا اور خطرات کی پیش بندی کا یہ طریق تو بہرحال صحیح نہیں ہے کہ سرے سے کام ہی نہ کیا جائے۔ زندگی بذات خود ایک عظیم چیلنج ہے جس کا مواجہہ ہر ذی حیات کے لئے لازم و لابدّ ہے۔ الّا آنکہ وہ زندگی ہی سے مستعفی ہو جائے اسی طرح **اسلام و ایمان** بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ انسان کے کاندھے پر لا ڈالتے ہیں جن کے شعور سے انسان پر بجا طور پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

لیکن ان سے جی چرانا اور فتنوں کے اندیشے سے وہ روش اختیار کرنا جس پر قرآن حکیم کا وہ فتویٰ راست آئے کہ "اَلَا فِی الْفِتْنَۃِ سَقَطُوْا"[2]۔ یقیناً دانش مندانہ روش نہیں! —— جن لوگوں کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ صلوٰۃ و صوم اور حج و زکوٰۃ کے علاوہ بھی دین کا کوئی تقاضہ اور مطالبہ ہے۔ وہ تو شاید اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی عذر پیش کر سکیں لیکن جن پر یہ بات منکشف ہو چکی ہو کہ شہادت حق اور اقامت دین بھی مسلمان کے دینی فرائض میں شامل ہیں اور وہ ان کے بارے میں عنداللہ مسئول ہیں ان کے لئے تو ایک ہی راہ ممکن ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی نصرت و حمایت کی امید پر اور اسی سے ہدایت و استقامت کی دعا کرتے ہوئے ان فرائض کی ادائیگی پر کمربستہ ہو جائیں۔ اس کے سوا "مَعْذِرَۃً اِلٰی رَبِّکُمْ" کی بھی کوئی سبیل کم از کم قرآن حکیم

[1] سورۃ والنجم آیت ۳۴: "اور دیا کچھ تھوڑا سا اور فوراً رک گیا!"

[2] سورہ توبہ کی آیت ۴۹: ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں ہمیں رخصت عطا فرما دیجئے اور خواہ مخواہ کے امتحان میں نہ ڈالیے: آگاہ ہو جاؤ کہ امتحان میں تو پہلے ہی ناکام ہو چکے!"

سے تو معلوم نہیں ہوتی! گویا بقول شاعر ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ مرحلہ سخت ہے اور جان عزیز!

دوسری طرف بعض حضرات نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ تم لوگوں کے سامنے دین کے مطالبات تو بہت بلند و بالا بیان کرتے ہو لیکن ان کی ادائیگی کی کوئی عملی صورت ان کے سامنے نہیں آتی۔ تم نے خود جو کام عملاً شروع کیا ہے اس میں لوگوں کی شرکت کے مواقع بہت محدود ہیں "تحریک تعلیم و تعلم قرآن" میں بالفعل صرف وہی لوگ شریک ہو سکتے ہیں جو عربی سیکھ سکیں اور قرآن کا علم اس حد تک حاصل کر سکیں کہ دوسروں تک پہنچانے کے قابل ہو سکیں اور ظاہر ہے کہ یہ سب کے لئے ممکن نہیں۔ اب جو شخص نہ عربی سیکھ سکتا ہو نہ قرآن مجید کا درس دے سکتا ہو وہ تمہارا شریک کار بنے تو کیونکر؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَ عَلَّمَهٗ" لیکن ظاہر ہے کہ یہ ہر شخص کے کرنے کا کام نہیں ہے۔

تمہارے درس قرآن سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایمانِ حقیقی کا رکن لازم جہاد فی سبیل اللہ ہے، جس کی غایتِ اولیٰ فریضۂ شہادتِ حق کی ادائیگی ہے اور غایت قصویٰ اعلاءِ کلمۃ اللہ اور غلبۂ دینِ حق کی جدوجہد، لیکن تم یہ نہیں بتاتے کہ آخر ان فرائض کی ادائیگی کی عملی شکل کیا ہو؟ لوگ کیا کریں؟ کیسے جمع ہوں؟ کہاں سے سفر کا آغاز کریں؟ اور کس کی رہنمائی میں آگے چلیں؟ اگر تم ان سوالوں کا جواب نہیں دیتے اور لوگوں کے لئے عمل کی راہ نہیں کھولتے تو بجائے اس کے کہ تمہاری طرف سے ان پر حجت قائم ہو الٹی ان کی حجت تم پر قائم ہوتی جا رہی ہے!

بعض نے طنزاً اور بعض نے خلوص کے ساتھ یہ بھی کہا کہ تمہارے درسِ قرآن میں شریک ہونے والوں کی عظیم اکثریت محض روائتی اور رسمی طور پر حصول ثواب کی خاطر درس سنتی ہے۔ جیسے ہی تم نے عمل کے لئے پکارا اور "مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰهِ!" کی ندا دی تم خود دیکھ لوگے کہ ساری بھیڑ چھٹ جاتے گی گویا ع "دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں!" تو اگرچہ ان کی یہ بات کلیۃً تو درست نہیں ہے اس لئے کہ متعدد مثالیں ایسی موجود ہیں کہ اس سلسلۂ درس سے منسلک ہو کر عملی اعتبار سے لوگوں کی زندگیوں میں عظیم انقلاب برپا ہو گیا۔ تاہم ادھر کچھ عرصے سے میں خود بھی نہایت شدت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ ہمارے حلقۂ احباب میں درس قرآن کے سلسلے کو واقعتہً ایک رسم اور روایت کی حیثیت حاصل ہوتی جا رہی ہے اور گویا نفسِ درس قرآن

ہی مقصود بالذات بنتا چلا جا رہا ہے اور بہت سے لوگ اسے اپنے معمول (ROUTINE) میں داخل کر کے مطمئن ہو گئے ہیں! ——— یہ واقعہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے اپنے دورِ انحطاط میں دین کے اعلیٰ سے اعلیٰ اعمال کو محض رسم بنا کر رکھ دینے کے فن میں بید طولیٰ حاصل کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں اس میں مہارت تامہ حاصل ہے لیکن میں لرز جاتا ہوں اس خیال سے کہ اگر قرآن کا پڑھنا پڑھانا اور سیکھنا سکھانا بھی محض ایک رسم بن کر رہ گیا تو پھر اور کون سی چیز رہ جائے گی جو لوگوں کو آمادۂ عمل کر سکے ——— اور میں کانپ اٹھتا ہوں اس احساس سے کہ اگر لوگ سورۂ صف اور سورۂ حدید کو بھی 'پی' گئے اور نشے سے مست نہ ہوئے اور سورۂ عنکبوت، سورۂ احزاب اور سورۂ توبہ کو بھی بے سمجھے بوجھے نہیں بلکہ خوب سمجھ کر اور ایک بار نہیں بار بار پڑھ گئے لیکن معاملہ وہی رہا کہ ع " زمین جنبد نہ جنبد گل محمدؐ "! تو " فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ؟"[1]

میرے لئے اس معاملے کا سب سے زیادہ قابل خدر پہلو یہ ہے کہ اگر لوگوں کی بے عملی اور ان کے تعطّل و جمود میں کچھ دخل میری ہچکچاہٹ اور میرے تذبذب کو بھی حاصل ہوا تو کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کون سی زمین مجھے پناہ دے گی! گویا میرے سامنے اب یہ معاملہ بالکل دو ٹوک طور پر آ چکا ہے کہ یا تو یہ صورت حال ختم ہونی چاہیئے کہ " یہ صُور پھونک کے تم سو گئے کہاں آخر ؟ " اور سیدھی طرح دین کے تقاضوں کے بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ادائیگی کے لئے واضح لائحہ عمل بھی پیش کیا جائے اور خود راہِ عزیمت پر پیش قدمی کر کے لوگوں کے لئے راستہ کھولا جائے یا پھر قرآن مجید کے اس انقلابی درس کا کام بھی کسی ایسے باہمت اور صاحبِ عزیمت انسان کے لئے چھوڑ دیا جائے جو محض درس ہی نہ دے سامنے آ کر لوگوں کی رہنمائی کا فرض بھی انجام دے سکے! گویا میرے نزدیک اب صورتِ مسئلہ یہ ہے کہ " یا چناں کن یا چنیں! " اور ع " یا سراپا نالہ بن جا یا نوا پیدا نہ کر! "

اندریں حالات، جیسا کہ میں آغاز میں عرض کر چکا ہوں، میں نے اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق کے بھروسے پر یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ میری مساعی صرف درس و تدریس اور تعلیم و تعلّم قرآن تک محدود نہیں رہیں گی بلکہ میں خالص دینی بنیادوں پر ایک نئی جماعت یا تنظیم قائم کرنے کی کوشش

---

[1] سورہ مرسلات کی آخری آیت : " اب اس کے بعد وہ آخر کس بات پر یقین لائیں گے ؟ "

کروں گا جس میں وہ لوگ شامل ہوں جو :

اوّلاً ـــــ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی جانب سے عاید کردہ حلال و حرام کی جملہ قیود کی پابندی کا عہد کریں اور اس معاملے میں رخصتوں کے بجائے عزیمت کی راہ پر گامزن ہونے کے لئے آمادہ ہوں۔

ثانیاً ـــــ 'سمع و طاعت' کے ٹھیٹھ اسلامی اصول پر مبنی نظمِ جماعت کی پابندی کا عہد کریں اور معروف کے دائرے کے اندر اندر اطاعت امیر کے التزام کے لئے پوری طرح آمادہ ہوں ـــــ اور

ثالثاً ـــــ یہ عہد کریں کہ دنیوی زندگی اور اس کے لوازمات کے باب میں کم از کم پر قناعت اور 'قوتِ لایموت' پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی بہتر اور بیشتر مساعی اور اپنے اموال اور اوقات کا معتدبہ حصّہ احیائے اسلام اور تجدید دین کی کوشش اور شہادتِ حق اور اقامت دین کی جد وجہد میں کھپا دیں گے۔

اپنی جگہ خود میں آپ سب کو گواہ بنا کر عہد کرتا ہوں کہ میرا جینا اور مرنا اللہ کے دین ہی کے لئے ہوگا اور میں ہر حال میں دین کو دنیا پر مقدّم رکھتے ہوئے اپنے بہتر اور بیشتر اوقات اور اپنی بہتر اور بیشتر صلاحیتیں جیسی کچھ اور جتنی کچھ وہ مجھ میں ہیں اور اپنی بہتر اور بیشتر قوتیں جیسی کچھ اور جتنی کچھ وہ مجھے حاصل ہیں فریضۂ شہادتِ حق کی ادائیگی اور اعلاءِ کلمۃ اللہ اور غلبۂ دین متین کی سعی و جہد کے لئے وقف کر دوں گا۔ گویا :

اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○
لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○

اللہ تعالیٰ مجھے اپنے عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ

اب آپ میں سے ہر شخص کو بھی اپنے آئندہ طرزِ عمل کے بارے میں واضح فیصلہ کرنا ہوگا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے اگر کوئی کامل رفاقت پر آمادہ ہو اور پوری طرح دست و بازو بننے کے لئے تیار ہو تب تو کیا ہی کہنے! "دیدہ و دل فرشِ راہ!" کوئی جزوی طور پر تعاون کرنا چاہے تو بھی سر آنکھوں پر، کوئی صرف دعاؤں اور نیک تمناؤں سے تائید کرے تو وہ بھی بسر و چشم قبول، اور اگر کوئی محض سامع کی حیثیت سے حسبِ سابق ہماری محفلوں اور مجلسوں کو رونق بخشتا رہے،

تو وہ بھی شکریہ کا مستحق۔

لیکن اپنی جگہ آپ کو چند باتیں واضح طور پر سمجھ لینی چاہیئں:

اوّلین اور اہم ترین معاملہ دین کے مطالبوں اور تقاضوں کے بارے میں انشراحِ صدر کا ہے۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص اس دعوتِ قرآنی سے کسی درجے میں بھی منسلک رہا ہو اسے اس سلسلے میں کوئی اشتباہ لاحق ہو سکے؛ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں اس 'تحریک تعلیم و تعلّم قرآن' کا پورا اٹھان مطالعۂ قرآن حکیم کے ایک منتخب نصاب کی اساس پر ہوا ہے جس کا مرکزی مضمون ہی یہ ہے کہ ازروئے قرآن انسان کی نجات کے لوازم کیا ہیں اور اللہ کی کتاب کی رُو سے ایک مسلمان کی دینی ذمہ داریاں و فرائض کیا ہیں۔ اس منتخب نصاب کو میں سرزمین لاہور میں متعدد بار بیان کر چکا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اگر کسی نے اسے تسلسل کے ساتھ ایک مرتبہ بھی پڑھ یا سن لیا ہو تو اسے کم ازکم اپنے دینی فرائض کے بارے میں ہرگز کوئی مغالطہ یا اشتباہ لاحق نہیں ہو سکتا۔

آپ نے آج ہی یہ نصاب مکمل کیا ہے ان بیس دنوں کے دوران میں قرآن حکیم کے جو مقامات آپ نے پڑھے ان میں سے ایمان اور عمل صالح کے تفصیلی مباحث سے قطع نظر کرتے ہوئے ذرا اس مرکزی مضمون کی ڈور پر نگاہ جمائیے جو گویا ان تمام مقامات کو پروئے ہوئے ہے تو بات پھر دو اور دو چار کی طرح واضح ہو جائے گی۔

'سورہ والعصر' مختصر ترین سورتوں میں سے ہونے کے باوجود ایمان اور عمل صالح کے ساتھ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کو بھی انسان کی نجات کی لازمی شرائط کی حیثیت سے پیش کرتی ہے، آیۂ برّ (سورہ بقرہ: ۱۷۷) نیکی کے صرف اسی تصور کو مبنی بر صداقت قرار دیتی ہے جس میں بدی سے پنجہ آزمائی کرنا اور اسے میدان جنگ میں للکارنا لازماً شامل ہو۔ سورۂ لقمان کا دوسرا رکوع اجتناب عن الشرک اور التزام توحید، شکرِ باری تعالیٰ اور برّ والدین اور ایمان بالمعاد اور اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ 'امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' کو بھی لازمی قرار دیتا ہے۔ سورۂ حٰم السجدہ میں دعوت الی اللہ کی پُرزور ترغیب ملتی ہے[1]۔ سورۂ حجرات کے آخری حصّے میں یقین قلبی کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ اور اس میں جان اور مال کھپانے کو بھی ایمانِ حقیقی کے لوازم میں سے شمار کیا گیا ہے، سورۂ حج کا آخری رکوع " اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ " کے ساتھ " جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ " کا حکم بھی سناتا ہے اور اس کی غرض و غایت

[1] اس موضوع پر میری تقریر اسی شمارے میں شائع کی جا رہی ہے۔ (اسرار احمد)

قرار دیتا ہے شہادتِ حق کو، بفحوائے الفاظ قرآنی " لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" سورہ صف پھر عذاب الیم سے چھٹکارا پانے کے لئے ایمان کے ساتھ ساتھ " وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ" کی شرط عاید کرتی ہے اور اس کا ہدف و مقصود قرار دیتی ہے غلبۂ دین حق کو، بفحوائے الفاظِ قرآنی " لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ " اور محبوبیت خداوندی کی شرط کے طور پر پیش کرتی ہے۔ اس اللہ کی راہ میں اس طرح جنگ کرنے کو گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں کہ کوئی رخنہ ڈالا ہی نہ جا سکے۔ سورۂ حدید دین کے تمام تقاضوں کو دو الفاظ میں سمیٹ کر بیان کرتی ہے ایک[1] ایمان اور دوسرے[2] انفاق اور یہاں انفاق سے مراد صرف انفاقِ مال نہیں بلکہ بذلِ نفس بھی ہے۔ چنانچہ اسی کی کوکھ سے فوراً ہی قتال بھی برآمد ہو جاتا ہے اور بالآخر ارسالِ رسل، انزالِ کتاب و میزان اور تخلیق حدید سب کی غرض یہ بیان ہوتی ہے کہ " وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَنْ يَنْصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ" یعنی اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون ہیں اس کے وہ وفادار بندے جو اس کی اور اس کے رسولوں کی نصرت و حمایت میں سلاح جنگ ہاتھ میں لے کر سربکف میدان میں نکل آئیں ——— پھر سورۂ عنکبوت ہو یا سورۂ احزاب، سورۂ توبہ ہو یا سورۂ حدید سب اس راہ سے گریز اور اس کے شدائد و مصائب سے گھبرانے اور ہمت ہار جانے پر نفاق کی وعید سناتی ہیں جس کا انجام ہے :

" خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ "

تو بتایئے کہ آخر فرار کی راہ کون سی باقی رہ گئی؟[1] مجھے تو عافیت کی راہ صرف ایک نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ انسان قرآن کو اوّل تو پڑھے ہی نہیں یا پڑھے تو کم از کم سمجھے نہیں۔ ورنہ قرآن تو جس صراط مستقیم یا سواء السبیل کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کے ناگزیر سنگ ہائے میل وہی ہیں جو میں نے ابھی بیان کئے اور اس کی آخری منزل وہ ہے جو سورۂ احزاب میں بیان ہوئی یعنی یہ کہ یا تو انسان " فَمِنْهُمْ مَنْ قَضَىٰ نَحْبَهُ " کی فہرست میں شامل ہو کر سرخرو ہو جائے یا پھر " وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ " کے زمرے میں شریک ہو کر اپنی باری کا انتظار کرے۔ غالباً اسی احساس کے تحت کہا تھا علامہ اقبال مرحوم نے کہ :

رفت سوزِ سینۂ تاتار و کرد
یا مسلماں مرد یا قرآں بمرد!

---

[1] جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں (فیض)

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ کسی مخلوق کی تصنیف یا تالیف نہیں، خالق کا کلام ہے، کسی انسان کے نظریات نہیں جو بدل بھی سکتے ہوں، قرآن کی آیات محکمات ہیں جو اٹل بھی ہیں اور غیر مبدّل بھی، یہ ہزل نہیں قولِ فصل ہے[1]، پھر چیستاں نہیں کتابِ مبین ہے اور کسی مردہ زبان میں نہیں لسانِ عربی مبین میں ہے ——— اور اچھی طرح جان لیجئے کہ اگر قرآن حکیم کے ان مقامات کو پڑھتے ہوئے آپ کے دل نے گواہی دی ہو کہ ان کا جو معنی و مفہوم اور مراد و مقصود میں نے بیان کیا ہے وہ حق ہے تو قرآن کی جانب سے ایک حُجّت آپ پر قائم ہو چکی۔ اب دو ہی راستے کھلے ہیں۔ یا تو ان فرائض کی ادائیگی پر کمربستہ ہو جائیں اور قرآن کو اپنے حق میں حُجّت اور دلیل راہ بنائیں یا اس سے پہلو تہی کی روش اختیار کر کے اسے اپنے خلاف حُجّت اور برہان قاطع بنالیں[2]۔ تیسری کوئی راہ ممکن نہیں!

دوسرا مسئلہ میرے ساتھ تعاون کرنے یا نہ کرنے اور میرا ساتھ دینے یا نہ دینے کا ہے تو سیدھی سی بات ہے اگر آپ کو کسی معقول سبب سے میرے خلوص و اخلاص پر اعتماد نہ ہو یا آپ کو میرے بارے میں کوئی حقیقی خدشہ اور واقعی اندیشہ لاحق ہو تو آپ ہرگز میرا ساتھ دینے پر مکلف نہیں۔ لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ اس سے آپ کے فرائض بہرحال ساقط نہیں ہو جاتے۔ اگر آپ کو کسی اور پر اعتماد ہو تو اس کے ساتھ مل کر کام کریں ورنہ از خود کھڑے ہوں اور اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی فکر کریں ——— اور خود ایک قافلہ تشکیل دے کر سفر کا آغاز کر دیں۔

لیکن اگر آپ کے پاس کوئی معقول وجہ مجھ سے سوءِ ظن کی نہیں ہے تو پھر آپ پر لازم ہے کہ میرا ساتھ دیں اور خواہ مخواہ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ نہ بنائیں۔ اس معاملے میں آپ کا اصل مفتی آپ کا دل ہے[3]۔ اسے ٹٹولیے۔ اگر وہ مجھ پر اعتماد کے حق میں رائے دے تو گویا ایک دوسری حُجّت آپ پر قائم ہو گئی اور آپ پر واجب ہو گیا کہ میرا ساتھ دیں۔ خوب سمجھ لیجئے کہ محض گریز اور فرار کی خاطر الزام و اعتراض سے یہاں تو آپ دامن بچا جائیں گے خدا کے یہاں معاملہ مشکل ہو جائے گا

اس سلسلے میں میں آپ کو کھلی اجازت دیتا ہوں کہ میرے بارے میں جو شبہات بھی آپ کے دل میں آتے ہوں بلا جھجک بیان کریں اور جو دریافت کرنا ہو بلا تکلف دریافت کریں خواہ وہ میرے

---

[1] "اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ" (سورۂ طارق)

[2] "اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ" (الحدیث)

[3] "اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَاِنْ اَفْتَاكَ الْمُفْتُوْنَ" (الحدیث)

ال سے متعلق ہو یا ماضی سے اور خواہ اس کا تعلق میری پبلک لائف سے ہو خواہ نجی زندگی سے!
بن یہ احتیاط بہرصورت ملحوظ رہے کہ مجھے وضاحت کا موقع دیئے بغیر میرے بارے میں کوئی رائے قائم
کریں۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ یہ محض آپ کا سوءِ ظن ہو اور آپ سورہ حجرات میں یہ الفاظ پڑھ
چکے ہیں کہ "اِجْتَنِبُوا کَثِیْراً مِنَ الظَّنِّ، اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ !"

اس موقع پر ابتداء میں خود بھی میں اپنے بارے میں بعض وضاحتیں کئے دیتا ہوں :
ایک یہ کہ میں عالم دین ہونے کا ہرگز مدعی نہیں بلکہ مجھے اپنی نسبتِ اُمّیت پر فخر ہے۔ گویا
ل علامہ اقبال مرحوم ع "میں نہ عارف، نہ مجدّد، نہ محدّث نہ فقیہہ !" لہٰذا مجھے اپنے
بھی معاملات میں رائے دینے کا ہرگز کوئی شوق نہیں بلکہ میں صاف اقرار کرتا ہوں کہ مجھ میں اس
اہلیت ہی موجود نہیں ہے ——— میری کل حیثیت قرآن کے ایک ادنیٰ طالب علم اور دین کے
ادنیٰ خادم کی ہے،

البتہ قرآن کے مطالعے سے مجھے یہ ضرور معلوم ہو گیا ہے کہ دین میں مقدّم
کیا ہے اور مؤخر کیا، اوّلیت کسے حاصل ہے اور ثانوی درجہ کس کا ہے،
جڑ اور اصل کی حیثیت رکھنے والی چیزیں کون سی ہیں اور فروعات کی
حیثیت کن کی ہے"

گویا "حکمتِ دین" کے اس شعبے سے اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک حصہ عطا فرمایا ہے جس کی جانب
رہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن الفاظ مبارک میں ملتا ہے جو آپ نے حضرت معاذ ابن جبل
اللہ تعالیٰ عنہ، کو مخاطب کرکے ارشاد فرماتے تھے "اِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُکَ یَا مُعَاذُ
اْسِ هٰذَا الْاَمْرِ وَ ذِرْوَةِ السَّنَامِ !" یعنی اے معاذؓ اگر تم چاہو تو میں
ہیں یہ بتاؤں کہ ہمارے اس کام (دینِ حق) کی جڑ اور اساس کیا ہے اور اس کی سب سے اونچی
کون سی ہے اور مجھے خالصتہً تَحْدِیْثاً لِلنِّعْمَةِ یہ عرض کرنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ اس
ملے میں بحمد للہ مجھے اپنے آپ پر پورا اعتماد حاصل ہے اور میں پورے وثوق کے ساتھ جانتا
ہوں کہ اس اُمّت نے کس طرح دین کی جملہ اقدار کو تلپٹ کرکے رکھ دیا ہے اور اصل کو فرع اور
کو اصل کا درجہ دے کر فرائضِ دینی کا پورا تصور ہی مسخ کر دیا ہے۔ نتیجتہً حضرت مسیحؑ کے الفاظ
"مچھر چھانے جا رہے ہیں اور سموچے اونٹ نگلے جا رہے ہیں" اور ایک عظیم اکثریت کا حال یہ ہے کہ

انہیں نہ " راس ہذا الامر " سے کوئی بحث ہے نہ " ذروۃ السنام منہ " سے کوئی دلچسپی۔ صرف کچھ درمیانی اعمال اور ان کے بھی محض ظاہر کو کل دین سمجھے بیٹھے ہیں۔ گویا نہ جڑ کا دھیان نہ چوٹی کی فکر، تنے کی بھی صرف چھال نے کل دین کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور اب ساری بحث وتمحیص، قیل قال، مناظرہ و مجادلہ اور تحقیق و تفحص کا موضوع صرف رفع یدین، آمین بالجہر اور تعدادِ رکعاتِ تراویح ایسے فروعی مسائل بن کر رہ گئے ہیں! ـــــــ اور میں علیٰ وجہ البصیرت جانتا ہوں کہ اصلاحِ احوال کی کوئی صورت اس کے بغیر ممکن نہیں کہ اس معاملے میں نسبت و تناسب کو از سرِ نو درست کیا جائے، چنانچہ آپ کو بھی میرا مشورہ یہ ہے کہ فروعات کے باب میں اہل سنت کے جس مسلک پر آپ چاہیں عمل پیرا ہوں، اور فقہی معاملات میں اپنے ہم مسلک علماء ہی کی جانب رجوع کریں، البتہ دوسروں کے لئے وسعتِ قلب پیدا کریں اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں اختلاف سے دل گرفتہ نہ ہوں ـــــــ البتہ دین کی جڑ اور اس کے " ذروۂ سنام " کے بارے میں کوئی اشکال یا اشتباہ ہو تو مجھے وضاحت کا موقع دیں۔ پھر اگر آپ کا دل مطمئن ہو تو میری بات قبول کر لیں ورنہ میرے منہ پر دے ماریں۔

دوسرے یہ کہ مجھے اپنی عملی کوتاہیوں اور کمزوریوں کا بھی بخوبی علم ہے اور مجھے نفسِ مزکی ہونے کا ہرگز کوئی دعویٰ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ " من آنم کہ من دانم "! اور جیسا کہ میں تفصیلاً عرض کر چکا ہوں یہی وہ احساس تھا جو مجھے اب تک اس راہ میں پیش قدمی سے روکے رہا اور اب بھی اقدام کی جرأت کر رہا ہوں تو صرف اس دعا کے سہارے کہ " رَبِّ آتِ نَفْسِی هُدَاهَا وَ زَكِّهَا فَاِنَّكَ خَيْرُ مَنْ زَكَّاهَا " اپنے بہت سے عیوب پر تو میں خود بھی مطلع ہوں اور ان کو دُور کرنے کی امکان بھر سعی کروں گا۔ مزید یہ جو بھی مجھے متنبہ کرے گا اس کا شکریہ ادا کروں گا اور انشاء اللہ العزیز اس کی بھی اصلاح کی سعی کروں گا۔ بیدِ اللہ التوفیق و علیہ التکلان!

تیسرے یہ کہ میرا ایک ماضی بھی ہے جس سے دستبردار ہونے کے لئے میں ہرگز تیار نہیں۔ اس لئے کہ مجھے اس پر نہ کوئی ندامت ہے نہ پشیمانی۔ مجھے پورا اطمینان ہے کہ میں نے اپنا جو وقت جمعیت طلبا یا جماعت اسلامی میں صرف کیا وہ ہرگز ضائع نہیں ہوا۔ اور اپنی جو قوتیں اور صلاحیتیں ان میں کھپائیں وہ قطعاً رائیگاں نہ گئیں۔ اس لئے کہ میں نے یہ کام خلوص کے ساتھ محض خدمتِ دین کے جذبے سے تحت کیا لہٰذا اللہ کے یہاں میرا اجر بالکل محفوظ ہے۔ میں وہاں تھا تو اللہ کے

لئے تھا اور وہاں سے نکلا تو بھی صرف اللہ کے لئے نکلا۔ کسی سے ذاتی نوعیت کی کوئی شکایت یا کسی قسم کی کوئی رنجش اس علیحدگی کا باعث نہیں بنی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج آپ کے سامنے اپنا پورا ماضی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور اپنی امکانی حد تک اس میں سے کسی چیز کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بعد بھی میں یہ چاہتا ہوں کہ جو حضرات اس کام میں میرا ساتھ دینے کا کوئی ارادہ یا خواہش دل میں پاتے ہوں وہ میری کتاب " تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ " اور " میثاق " کا ۶۷-۱۹۶۶ء کا فائل ضرور نظر سے گزار لیں۔ مبادا کوئی چیز بعد میں ان کے علم میں آئے اور وہ جز بز ہوں۔ پھر ان کے مطالعے کے بعد بھی کوئی اشکال ذہن میں رہ جائے تو میں حاضر ہوں وضاحت طلب کیجئے اور کامل اطمینان کے بعد ہی رفاقت اختیار کیجئے!

آئندہ کام کا جو نقشہ میرے ذہن میں ہے اس کو سمجھنے کے لئے میں درخواست کروں گا کہ ایک تو میرے کتابچے " اسلام کی نشاۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام " کا مطالعہ پوری توجہ کے ساتھ کر لیا جائے، جو طبع شدہ موجود ہے، اور دوسرے ۶۷ء میں تنظیم اسلامی کے قیام کی جو سعی ہم نے کی تھی اس کی قرار داد اور اس کی توضیحات بھی غور سے پڑھ لی جائیں اور اس پر جو تقاریر مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن نے کی تھیں ان کو بھی نظر سے گزار لیا جائے۔[1] وہ قرار داد اور اس کی توضیحات دراصل میں نے ہی لکھی تھیں جنہیں معمولی سی لفظی ترامیم کے ساتھ اجتماع نے اختیار (ADOPT) کر لیا تھا اور میں ان پر آج بھی اتنا ہی مطمئن ہوں جتنا اُس وقت تھا۔

رہا آئندہ کا تفصیلی لائحہ عمل ـــــ اور ہیئت تنظیمی کی مفصل صورت تو ان مسائل کے بارے میں میں اس وقت کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا اس لئے کہ ان کا دار و مدار کلیتہً اس پر ہے کہ کتنے لوگ تعاون پر آمادہ ہوتے ہیں اور کتنی کچھ صلاحیتوں اور قوتوں کا سرمایہ جمع (POOL UP) ہوتا ہے۔

آخر میں " من انصاری الی اللہ! " کے سوال پر اپنی گفتگو ختم کرتا ہوں اس وضاحت

---

[1] یہ تمام چیزیں اس شمارے میں یکجا شائع کی جا رہی ہیں مزید برآں میری ایک تقریر بھی شائع کی جا رہی ہے جو اجتماع رحیم یار خاں کے متصلاً بعد ایک موقع پر میں نے کی تھی اس سے بھی میرے ذہن کو سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے!

ایک نئی اسلامی تنظیم

کے قیام کا فیصلہ

روداد اجتماع رحیم یار خاں

منعقدہ ۶ تا ۹ ستمبر ۶۷ء

- قرارداد مع توضیحات
- تقریر مولانا امین احسن اصلاحی
- تقریر مولانا عبدالغفار حسن
- مولانا اصلاحی کا الوداعی خطاب

★

اور

تائید و تبصرہ

منجانب

- مولانا عبدالماجد دریابادی۔ مدیر صدق جدید، لکھنؤ
- مولانا عبدالباری ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرارداد

آج ہم اللہ کا نام لے کر ایک ایسی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کرتے ہیں جو دین کی جانب سے عاید کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری ممد و معاون ہو۔

ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے اسی کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات دین کا اصل موضوع ہے اور پیش نظر اجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے۔

لہٰذا پیش نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیئے کہ اس میں فرد کی دینی اور اخلاقی تربیت کا کماحقہٗ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکا کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو۔ ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادات اور اتباع سنت سے ان کا شغف اور ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے۔ عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں ان کی حس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لئے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے۔ ان تمام امور کے لئے ذہنی اور علمی رہنمائی کے لئے ساتھ ساتھ عملی تربیت اور تاثیر صحبت

کے اہتمام کی جانب خصوصی توجہ ناگزیر ہے۔

دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک "الدین النصیحہ" کی روح اور "الاقرب فالاقرب" کی تدریج ضروری ہے لہٰذا دعوت و اصلاح کے عمل کو فرد سے اوّلاً کنبہ اور خاندان اور پھر تدریجاً ماحول کی جانب بڑھنا چاہیئے۔ اس ضمن میں نئی نسل کی دینی تعلیم و تربیت کا خصوصی اہتمام ناگزیر ہے۔

عامۃ الناس کو دین کی دعوت و تبلیغ کی جو ذمہ داری امت مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عاید ہوتی ہے اس کے ضمن میں ہمارے نزدیک اہم ترین کام یہ ہے کہ جاہلیت قدیمہ کے باطل عقائد و رسوم اور دورِ جدید کے گمراہ کن افکار و نظریات کا مدلل ابطال کیا جائے اور حیات انسانی کے مختلف پہلوؤں کے لئے کتاب و سنت کی ہدایت و رہنمائی کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ ان کی اصلی حکمت اور عقلی قدر و قیمت واضح ہو اور وہ شبہات و شکوک رفع ہوں جو اس دور کے لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں۔

مندرجہ بالا رہنما اصولوں کی روشنی میں عملی جد و جہد کے آغاز اور ایک ہیئت اجتماعی کی باقاعدہ تشکیل کے لئے مندرجہ ذیل اصحاب پر مشتمل ایک مجلس مشاورت کے تقرر کی توثیق کی جاتی ہے۔

۱ : مولانا امین احسن اصلاحی
۲ : مولانا عبدالغفار حسن
۳ : مولانا عبدالحق جامعی
۴ : شیخ سلطان احمد (معتمد)
۵ : سردار محمد اجمل خاں لغاری
۶ : ڈاکٹر محمد نذیر مسلم
۷ : ڈاکٹر اسرار احمد

توضیحات

قرار داد میں جن امور کی وضاحت کی گئی ہے ان میں اوّلین اور اہم ترین امر یہ ہے کہ "ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسی کی اخلاقی اور روحانی تکمیل اور فلاح و نجات دین کا اصل موضوع ہے اور پیش نظر اجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے اصل نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے"۔ —— اس تصریح کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ماضی میں مسلمانوں کو ان کی یہ ذمہ داری تو بالکل ٹھیک یاد کرائی گئی کہ جس دین کے وہ مدعی ہیں اسے دنیا میں عملاً قائم کرنے کی سعی و جہد بھی ان پر فرض ہے اور یہ کہ دین محض ذاتی عقائد اور کچھ مراسم عبودیت یعنی انسان اور رب کے مابین پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کو اپنے احاطے میں لینا چاہتا ہے لیکن ان امور پر اس قدر زور دیا گیا کہ بندے اور رب کے مابین تعلق کی اہمیت اور افراد کی اپنی علمی، اخلاقی اور روحانی ترقی نظر انداز ہوتی چلی گئی۔ آئندہ جو کام پیش نظر ہے اس کے اصول و مبادی میں یہ نکتہ بہت زیادہ قابل لحاظ رہے گا کہ ایک مسلمان کا اصل نصب العین صرف نجات اخروی اور رضائے الٰہی کا حصول ہے اور اس کے لئے اسے اصل زور اپنی سیرت کے تطہیر و تزکیئے اور اپنی شخصیت کی تعمیر و تکمیل پر دینا ہوگا جس سے تعلق مع اللہ اور محبت خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اضافہ ہوتا رہے اور اس میں زیادہ سے زیادہ اخلاص پیدا ہوتا چلا جائے۔ دین کی تائید و نصرت اور شہادت و اقامت یقیناً فرائض دینی میں سے ہیں لیکن ان کے لئے کوئی ایسی اجتماعی جد و جہد ہرگز جائز نہیں ہے جو افراد کو ان کے اصل نصب العین سے غافل کرکے انہیں محض ایک دنیوی انقلاب کے کارکن بنا کے رکھ دے! —— چنانچہ پیش نظر اجتماعیت میں اوّلین زور افراد کی دینی و اخلاقی تربیت پر دیا جائے گا اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے گا کہ "اس کے تمام شرکاء کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو، ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے، ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو، عبادات اور اتباع سنت سے ان کا شغف اور ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے، عملی زندگی میں حلال و حرام کے بارے میں ان کی حس تیز تر اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لئے ان کا جذبہ

ترقی کرتا چلا جائے۔"

" دینی جذبات کے جِلا " کے لئے قرآن مجید کی بلا ناغہ تلاوت مع تدبّر، سیرت نبویؐ اور سِیَر الصحابہ رضؓ کا مطالعہ، مجالس وعظ کا انعقاد، باہمی مذاکرۂ آخرت اور مضامین موعظت پر مشتمل آسان لٹریچر کی اشاعت پر زور دیا جائے گا۔

" علم میں مسلسل اضافے " کے لئے عربی زبان کی تحصیل کی عام ترغیب اور اس کا اہتمام، قرآن حکیم اور حدیث نبویؐ کے باقاعدہ حلقہ ہائے درس کا قیام اور جاہلیت قدیمہ و جدیدہ پر اسلام کے نقطہ نظر سے تنقیدی کتب کی نشر و اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔

مندرجہ بالا دونوں امور سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ جاہلیت قدیم و جدید دونوں کے اثرات قلوب و اذہان سے محو ہوں، عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو اور صحیح اسلامی عقائد کی تخم ریزی و آبیاری ہو سکے۔

شرکاءِ تنظیم کے دینی جذبات کے جِلا اور علم میں اضافے کا براہ راست اثر عملی زندگی پر پڑے گا اور ان کی زندگیوں میں دینی تبدیلی عملاً پیدا ہوتی چلی جائے گی لیکن اس میدان میں اس امر کی شدید ضرورت ہوگی کہ اس بات کی کڑی نگرانی کی جائے کہ یہ تبدیلی ہمہ جہتی ہو اور اعمال انسانی کے مختلف گوشوں میں متناسب انداز میں ظہور پذیر ہو، چنانچہ عبادات میں ذوق و شوق، معاملات میں احتیاط و تقویٰ اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں میں شغف اور دلچسپی متناسب انداز میں بڑھے۔ یہ صورت حال کہ جلسوں کے انعقاد کے ضمن میں تو پابندی بھی ملحوظ رہے اور جوش و خروش کا بھی مظاہرہ کیا جائے لیکن نماز باجماعت کی پابندی گراں محسوس ہو اور نوافل سرے سے خارج از بحث ہو جائیں۔ دین کی نصرت و حمایت کا جذبہ تو ترقی کرتا چلا جائے لیکن تزکیہ باطن کی طرف کوئی توجہ نہ دی جائے یا سنت نبویؐ کی حجیت و اہمیت پر دلائل تو ازبر ہوں لیکن خود اپنی زندگی میں اتباع نبویؐ کی جھلک نظر نہ آئے۔ نہ صرف یہ کہ افراد کے حق میں سم قاتل ہے بلکہ خود اجتماعیت کے لئے بھی سخت مضر اور مہلک ہے۔ لہٰذا اس امر کی کڑی نگرانی ضروری ہوگی کہ شرکاء میں عبادات سے شغف، اتباع سنت کا جذبہ، معاملات میں حلال و حرام کی حدود و قیود کی پابندی اور دعوتی و تنظیمی سرگرمیوں سے دلچسپی توافق و تناسب کے ساتھ بڑھیں۔ خصوصاً یہ احتیاط تو انتہائی لازمی ہوگی کہ پیش نظر اجتماعیت کے تنظیمی ڈھانچے میں جو لوگ آگے آئیں وہ تیزی و مستعدی اور نفاست و باقاعدگی سے کام کرنے کی صلاحیت کے اعتبار سے چاہے کسی قدر تہی دست ہوں، عبادات اور اتباع سنت کے ذوق و شوق سے ہرگز تہی دامن

نہ ہوں۔

شرکاء جماعت میں مندرجہ بالا تبدیلیاں یا بالفاظ دیگر ان کے نفوس کے تزکیہ اور ان کی شخصیت کی دینی تعمیر کے لئے جہاں ذہنی و علمی رہنمائی اور فکری تربیت لازمی و لابدی ہیں وہاں عملی تربیت اور تاثیر صحبت کا مؤثر اہتمام بھی ضروری و ناگزیر ہے۔ اس غرض کے لئے مختلف مقامات پر تربیت گاہوں کا سلسلہ بھی شروع کیا جا سکتا ہے اور ایک ایسی مرکزی تربیت گاہ کا قیام بھی عمل میں لایا جا سکتا ہے جس میں مختلف مقامات کے رفقاء کو پس کی صورت میں شریک ہوں اور ایک مقررہ میعاد میں انہیں قرآن و حدیث کے منتخب حصص کا درس بھی دیا جائے اور ایک ایسی دینی فضا بھی مہیا کی جائے جس میں ان کے دینی جذبات بھی از سر نو تر و تازہ ہوں اور ایک خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کا عملی تجربہ بھی حاصل ہو جائے۔

قرار داد کے بنیادی نکات میں سے دوسرا اہم اور بنیادی نکتہ یہ ہے کہ "دعوت کے ضمن میں ہمارے نزدیک 'الدین النصیحۃ' کی روح اور الاقرب فالاقرب کی تدریج ضروری ہے"۔ پیش نظر اجتماعیت لازماً یہ چاہے گی کہ اس کا ہر شریک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں داعی الی اللہ اور اپنے ماحول میں حسب مقدور و صلاحیت اور بقدر ہمت و استطاعت ہدایت کا ایک روشن چراغ بن کر رہے اور اس کی شخصیت پر بحیثیت مجموعی داعیانہ رنگ غالب ہو جائے۔

اس دعوت کا اصل محرک ابنائے نوع کی ہمدردی اور نصح و خیر خواہی کا جذبہ ہونا چاہیئے اور اس میں نہ تو اپنی شخصیت کی نمود کا کوئی شائبہ شامل ہونا چاہیئے نہ طلب جاہ کا۔ حتیٰ کہ اللہ و رسول اور شریعت کی وفاداری کے جذبے کے تحت اگر کبھی کسی فرد، گروہ یا ادارے پر تنقید کی نوبت آ جائے تو اس میں بھی ہمدردی اور دلسوزی غالب رہے اور ذاتی رنجش یا انتقام نفس کا کوئی شائبہ نہ پیدا ہونے پائے۔

اس سلسلے میں یہ وضاحت بہت ضروری ہے کہ ہمارے معاشرے کا مجموعی مزاج اگرچہ دین سے بہت دور جا چکا ہے اور اس اعتبار سے انتہائی اصلاح طلب ہے لیکن دعوت و اصلاح کے عمل میں دو حقائق کا لحاظ ضروری ہے۔ ایک یہ کہ یہ معاشرہ ایک مجموعی اکائی ہے اور اس کے تمام طبقات میں انحطاط سرایت کر چکا ہے۔ اس اعتبار سے اس کے مختلف طبقات میں کمیت کا تھوڑا بہت فرق چاہے موجود ہو، کوئی بنیادی امتیاز موجود نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ انحطاط براہ راست نتیجہ ہے جذبات ایمانی کے ضعف اور کتاب و سنت کے علم کی کمی کا۔ اس میں دین دشمنی کا عنصر چند ایسی استثنائی

صورتوں کے سوا موجود نہیں ہے جو اگرچہ بجائے خود تو بہت خطرناک ہیں اور ان سے خبردار رہنے کی بھی ضرورت ہے۔ تاہم مجموعی اعتبار سے ہمارے معاشرے کے عام بگاڑ کا اصل سبب دین دشمنی نہیں بلکہ دین سے لاعلمی ہے! حکومت اس معاشرے کا جامع عکس اور ارباب اقتدار اس کا اہم جزو ہیں۔ ان کو اپنی اہمیت اور معاشرے میں اثر و نفوذ کی قوت و صلاحیت کے اعتبار سے دعوت و تخاطب میں اولیت تو دی جا سکتی ہے اور دی جانی چاہیئے لیکن انہیں دین کا دشمن قرار دے کر ان کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کرنے کے لئے عوام کے دینی جذبے کو مشتعل کرنا درآں حالیکہ خود عوام کی ایک عظیم اکثریت کا حال دین سے بے خبری اور عملی بُعد کے اعتبار سے خود کم و بیش وہی ہے جو اصحاب قوت و اختیار کا، نہ ان کی خیر خواہی ہے نہ خود دین کی۔ ارباب اقتدار کے حصول کی خاطر برسر اقتدار طبقے کے مخالف و معاند کی حیثیت اختیار کرنا تو یہ ہمارے نزدیک دینی نقطہ نگاہ سے نہایت مضر ہی نہیں سخت مہلک ہے جس سے کلی اجتناب لازمی و لابدی ہے۔ ہمارے نزدیک "ائمۃ المسلمین" اور "عامتھم" دونوں ہی نصح و خیر خواہی کے برابر مستحق اور دعوت و اصلاح کے یکساں محتاج ہیں!

یہاں یہ تصریح بھی ضروری ہے کہ ہماری دانست میں انتخابات کے ذریعے عمومی اصلاح کا نظریہ نری خام خیالی پر مبنی ہے۔ بحالات موجودہ تو اس امر کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں ہے کہ انتخابات کے ذریعے اصلاح کی امید کی جائے۔ ویسے بھی ہماری رائے میں انتخابات میں دوسری جماعتوں کے مخالف و مقابل کی حیثیت سے شرکت دعوت و اصلاح کے صحیح نہج کے منافی ہے اور اس سے قبول حق کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

داعی کے قلب میں اپنے ابنائے نوع کے لئے جس ہمدردی اور نصح و خیر خواہی کا ہونا لازمی ہے اسی کا ایک اہم مظہر رافت و رحمت اور شفقت و رقت کا وہ جذبہ ہے جو ابنائے نوع کو تکلیف اور مصیبت میں دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور عملی زندگی میں خدمت خلق اور ایثار و انفاق کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ دعوتِ دین اور خدمت خلق کا ایسا چولی دامن کا ساتھ ہے کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں بلکہ بلاخوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ دین کا وہ داعی جو خادم خلق نہ ہو اپنی دعوت میں دولت اخلاص سے محروم ہے اس ضمن میں البتہ یہ فرق ضرور پیش نظر رہنا چاہیئے کہ خدمت خلق کی اجتماعی سکیموں کو زیر عمل لانا بالکل دوسری بات ہے اور افراد میں خدمت خلق کے جذبے کا پیدا ہونا اور بڑھنا بالکل دوسری چیز ہے۔ خدمت خلق کی اجتماعی سکیموں

کی اہمیت اپنی جگہ کتنی ہی مسلّم ہو، دعوت دین کے نقطہ نظر سے اصل مطلوب افراد کے قلوب میں شفقت و رحمت کے جذبے اور عمل میں ایثار و انفاق کی کیفیت کا ظہور ہے۔ پیش نظر اجتماعیت میں اصل زور انشاء اللہ اسی پر دیا جائے گا!

دعوت کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس کا تخاطب لازماً بتدریج کے ساتھ داعی کے اپنے نفس سے شروع ہو کر (علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا ھتدیتم) اپنے اہل و عیال (قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا) اور کنبے قبیلے (وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ) سے ہوتے ہوئے اپنی قوم (یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ) اور پھر پوری انسانیت (لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ) تک پہنچنا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک یہ صورت کہ داعی اپنے آپ کو بھول جائے اور برّ و تقویٰ کی ساری دعوت دوسروں کو دیتا رہے، (اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ) یا اپنے خاندان اور کنبے قبیلے کو تو بھول جائے اور دُور دراز کے لوگوں میں ہدایت کی سوغات بانٹنے کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ نہایت خطرناک مرض کی علامت ہے۔ دعوت کے عمل کا صحیح نہج یہ ہے کہ الاقرب فالاقرب کے اصول پر آگے بڑھے اور جس سے جتنی قربت اور محبت داعی کو ہو دعوت و تخاطب میں اسی قدر اسے مقدم رکھا جائے۔ اس سلسلے میں یہ خیال البتہ صحیح نہ ہوگا کہ ایک مرحلے کی تکمیل کے بعد ہی دوسرا مرحلہ شروع کیا جائے۔ مطلوب صرف یہ ہے کہ دعوت کے عمل کو ایک فطری تدریج اور حسین تناسب کے ساتھ اپنی ذات، اہل و عیال، کنبے قبیلے اور پھر عوام الناس تک بڑھنا چاہیئے۔

اس سلسلے میں ہمیں اپنی اولاد اور فی الجملہ نئی نسل کے بارے میں خصوصی توجہ و اہتمام سے کام لینا ہوگا اس لئے کہ ان کے بارے میں ہم حدیث نبویؐ "كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ ..... الخ" کی رو سے براہ راست مسئول اور ذمہ دار ہیں۔ اولاد کی دینی تعلیم و تربیت کا یہ اہتمام ذاتی و انفرادی بھی ہوگا اور جہاں جہاں ممکن ہوگا اور وسائل دستیاب ہو سکیں گے اس امر کی سعی بھی کی جائے گی کہ ایسے مدارس اپنے اہتمام میں قائم کئے جائیں جن میں نئی نسل کے قلوب و اذہان میں ایمان کی تخم ریزی و آبیاری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کیا جائے۔ اس سلسلے میں متعدد رفقاء نے پہلے سے جو کوششیں اپنی انفرادی حیثیت میں شروع کر رکھی ہیں کوشش کی جائے گی کہ ان کو ایک باقاعدہ نظم کے تحت لا کر ان کی افادیت میں حتی الامکان اضافہ کیا جائے اور ان کے تجربات سے دوسرے مقامات پر مدارس کے قیام و اہتمام میں فائدہ اٹھایا جائے۔

وسائل دعوت کے ضمن میں کوئی تعیّن غیر ضروری ہے۔ حسب صلاحیت و استعداد انفرادی و نجی

گفتگو، خطاب ہائے عام، خطباتِ جمعہ اور درسِ قرآن و حدیث کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کے تمام جدید طریقوں کو اختیار کیا جا سکتا ہے!

قرارداد کا تیسرا اہم نکتہ "عامۃ الناس کو دین کی دعوت و تبلیغ" کی اس ذمہ داری سے بحث کرتا ہے جو "امت مسلمہ پر بحیثیت مجموعی عاید ہوتی ہے"۔ ہمارے نزدیک انذار و تبشیر، دعوت و تبلیغ اور شہادت حق علی الناس کی جو ذمہ داریاں انبیاء کرام علیہم السلام پر عاید ہوا کرتی تھیں، وہ اب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت کے ختم ہو جانے کے بعد آپ کی امت پر بحیثیت مجموعی عاید ہوتی ہیں۔ اوّل اوّل اس امت نے "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" کے نظام کے تحت اپنی اس ذمہ داری کو اجتماعی حیثیت سے ادا کیا۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے خاتمے کے بعد بھی ایک عرصے تک مسلمان حکومتیں اس فرض منصبی کو ادا کرتی رہیں۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک انفرادی و ذاتی طور پر دور دراز علاقوں میں پہنچ کر دین کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہے ادھر عرصے سے یہ سلسلہ بھی تقریباً ختم ہو چکا ہے اور امت مسلمہ بحیثیت مجموعی "کتمان حق" کے جرم کی مرتکب ہو رہی ہے اور صورت حال یہ ہے کہ امت کی تمام اجتماعی سرگرمیاں صرف اپنے دفاع اور دنیوی ترقی و استحکام تک محدود ہیں۔ کچھ تھوڑا بہت دینی رنگ کسی اجتماعی سرگرمی میں ہے بھی تو وہ بھی محض امت کی داخلی اصلاح کی حد تک ہے۔ ہمارے نزدیک یہ صورت حال سخت تشویش ناک ہے اور اس سے نہ صرف یہ کہ اُخروی باز پُرس کا اندیشہ ہے بلکہ ہماری رائے میں ہماری دنیوی نکبت و ذلت کا اصل سبب بھی یہی ہے!

اس ضمن میں ہمارے نزدیک اس وقت کرنے کا اہم ترین کام یہ ہے کہ ایک طرف ادیان باطلہ کے مزعومہ عقائد کا مؤثر و مدلل ابطال کیا جائے اور دوسری طرف مغربی فلسفہ و فکر اور اس کے لائے ہوئے زندقہ و الحاد اور مادہ پرستی کے سیلاب کا رُخ موڑنے کی کوشش کی جائے اور حکمتِ قرآنی کی روشنی میں ایک ایسی زبردست جوابی علمی تحریک برپا کی جائے جو توحید، معاد اور رسالت کے بنیادی حقائق کی حقانیت کو بھی مبرہن کر دے اور انسانی زندگی کے لئے دین کی رہنمائی و ہدایت کو بھی مدلل و مفصل واضح کر دے۔ ہمارے نزدیک اسلام کے حلقے میں نئی اقوام کا داخلہ اور جسدِ دین میں نئے خون کی پیدائش ہی نہیں خود اسلام کے موجود الوقت حلقہ بگوشوں میں حرارت ایمانی کی تازگی اور دین و شریعت کی عملی پابندی اسی کام کے ایک مؤثر حد تک تکمیل پذیر ہونے پر موقوف ہے اس لئے کہ دورِ جدید کے گمراہ کن افکار و نظریات کے سیلاب میں خود مسلمانوں کے ذہین اور تعلیم یافتہ

طبقے کی ایک بڑی تعداد اس طرح بہہ نکلی ہے کہ ان کا ایمان بالکل بے جان اور دین سے ان کا تعلق محض برائے نام رہ گیا ہے اور اسی بنا پر دین میں نت نئے فتنے اٹھ رہے ہیں اور ضلالت و گمراہی نت نئی صورتوں میں ظہور پذیر ہو رہی ہے۔

اس سلسلے میں انفرادی کوششیں تو اب بھی جیسی کچھ بھی عملاً ممکن ہیں جاری ہیں اور آئندہ بھی جاری رہیں گی۔ ضرورت اس کی داعی ہے کہ جیسے بھی ممکن ہو وسائل فراہم کئے جائیں اور ایک ایسے باقاعدہ ادارے کا قیام عمل میں لایا جائے جو حکمتِ قرآنی اور علم دینی کی نشر و اشاعت کا کام بھی کرے۔ اور ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا بھی مناسب اور مؤثر بندوبست کرے جو عربی زبان، قرآن حکیم اور شریعت اسلامی کا گہرا علم حاصل کر کے اسلامی اعتقادات کی حقانیت کو بھی ثابت کریں اور انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے جو ہدایات اسلام نے دی ہیں انہیں بھی ایسے انداز میں پیش کریں جو موجودہ اذہان کو اپیل کر سکے۔

آخر میں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیش نظر تنظیم ہرگز "الجماعت" کے حکم میں نہ ہوگی۔ الجماعت کا مقام ہماری دانست میں امت مسلمہ کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے۔ پیش نظر اجتماعیت کی حیثیت مسلمانوں کی ایک ایسی تنظیم کی ہوگی جس میں وہ لوگ شریک ہوں گے جو خود اصلاح نفس اور تعمیر سیرت کے خواہش مند ہوں اور ان جملہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا چاہیں جو دین کے جانب سے ان پر عاید ہوتی ہیں تاکہ ایک طرف ان کا باہمی تعاون ایک دوسرے کے لئے سہارا بن سکے اور دوسری طرف اصلاح معاشرہ کے لئے ایک مؤثر قوت فراہم ہو جائے۔

دین کی خدمت ایک نہایت وسیع و عظیم کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہے ہیں اور انشاء اللہ ان کے ساتھ ہمارا رویہ تعاون و تائید ہی کا ہوگا۔ اپنے فہم و فکر کے مطابق ہم بھی دین کی خدمت کی ایک ادنیٰ کوشش کے لئے جمع ہو رہے ہیں اور یہ توقع کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں کہ دین کے تمام خادم ہمیں اپنے رفیق راہ ہی گردانیں گے ——— اس تصریح کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ہم واقعتہً تمام دینی عناصر خصوصاً علمائے کرام کے تعاون کی شدید احتیاج محسوس کرتے ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

تقریر مولانا امین احسن اصلاحی

خطبہ مسنونہ کے بعد

بھائیو اور دوستو!

ایک طویل مدّت کے بعد ہم خیال و ہم مقصد دوستوں کی صحبت جو میسّر آئی ہے تو معلوم نہیں دل کے کتنے گوشے ہیں جن کے دریچے کھل گئے ہیں اور کتنے سوئے ہوئے خیالات ہیں جو جاگ پڑے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان ساری باتوں کو ایک صحبت میں کہہ ڈالنا ممکن نہیں ہے یہ تو جب بھی کہی جائیں گی مختلف قسطوں اور مختلف مجلسوں ہی میں کہی جائیں گی۔ اس وقت تو صورت حال یہ ہے کہ سرا نہیں مل رہا ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے، کیا بات کہی جائے کیا نہ کہی جائے اور شروع کرکے بات کہاں ختم کی جائے۔ اس الجھن کی وجہ سے آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں گفتگو صرف اس قرارداد کی وضاحت تک محدود رکھوں جو اپنے پورے ماله اور ما علیہ کے ساتھ آپ کے سامنے آچکی ہے۔

اس قرارداد کی وضاحت کرنے میں اس وجہ سے نہیں اٹھا ہوں کہ اس میں کوئی ابہام و اجمال ہے۔ یہ اپنے مقصد و مفہوم میں بالکل واضح ہے۔ جس طرح میں نے اس کو سمجھ لیا ہے اسی طرح آپ نے بھی اس کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ میری اس وضاحت کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس میں جو نصب العین اور جو طریقۂ کار اپنانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے بعض دلائل آپ کے سامنے عرض کروں تاکہ اس کی پوری اہمیت آپ کے سامنے آجائے۔

ہم نے اس قرارداد میں اللہ کا نام لے کر ایک ایسی تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا ہے "جو دین کی جانب سے عاید کردہ جملہ انفرادی و اجتماعی ذمّہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں ہماری مدد کرے" قرارداد کا یہ جملہ دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے ایک اس حقیقت کی طرف کہ آپ تنظیم کو بجائے خود غایت و مقصد نہیں سمجھتے بلکہ اس کو صرف دین کی عاید کردہ انفرادی و اجتماعی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اپنے لئے ممد و معاون سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف اس بات کی طرف کہ آپ اپنا نصب العین دین کو سمجھتے ہیں اور اس دین کو اپنی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں پر حاوی مانتے ہیں۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے وہ درحقیقت ایک بہت بڑے خطرے سے آگاہی ہے وہ خطرہ یہ ہے کہ جماعتیں اور تنظیمیں قائم تو ہوتی ہیں اصلاً کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لئے، لیکن قائم

ہو جانے کے بعد آہستہ آہستہ وہ خود نصب العین اور مقصد بن جاتی ہیں اور اصل نصب العین غائب ہو جاتا ہے۔ آپ کو اس خطرے سے ہر قدم پر ہوشیار رہنا ہے۔ اس چیز نے نہ صرف جماعتوں اور تنظیموں کو تباہ کیا ہے بلکہ ملکوں اور امتوں کو بھی بالکل برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اس تغیر کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوتا کہ اصل مقصد غائب ہو جاتا ہے بلکہ مقصد وسیلہ اور ذریعہ کا ایک ادنیٰ خادم اور چاکر بن کے رہ جاتا ہے۔ پھر تنظیم مقصد کی خدمت نہیں کرتی بلکہ مقصد کو اپنی خدمت اور اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتی ہے۔ مذہب کے نام پر قائم ہونے والی جماعتوں کے لئے یہ چیز خاص طور پر خطرناک ہے اس لئے کہ جب اس طرح کی کوئی جماعت خود اپنے وجود اور اس کے قیام و بقا کو مقصود بنا لیتی ہے تو وہ مذہب کی بھی جن چیزوں کو اپنے اس مقصد کی راہ میں مزاحم پاتی ہے ان کو بدل کر اپنے جماعتی اغراض کے سانچہ میں ڈھال لیتی ہے۔ مذاہب کی تاریخ ایک ساتھ شہادت دیتی ہے کہ اس چیز نے بے شمار تحریفات کی راہیں کھولی ہیں اور اس سے بڑے بڑے فتنے ظہور میں آتے ہیں۔ اس خطرے کے پیش نظر اس قرارداد میں اس امر کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے کہ تنظیم بجائے خود غایت و مقصد نہ بننے پائے۔ بلکہ وہ اصل مقصد کے وسیلہ و ذریعہ کی حد تک محدود رہے۔ قرارداد کے اس پہلو پر بہت سی باتیں کہنی ہیں جو آگے کے مراحل میں بالتدریج آپ کے سامنے آئیں گی۔ اس کے لئے لازماً اس کے تنظیمی ڈھانچہ میں ایسی حد بندیاں کرنی پڑیں گی جو اس کو بے راہ روی اور گمراہی سے محفوظ رکھیں۔

جہاں تک دوسری چیز یعنی دین ہی کو نصب العین بنانے کا تعلق ہے یہ کم از کم ہمارے اور آپ کے لئے محتاج دلیل نہیں۔ ہم خدا کے فضل سے مسلمان ہیں اور ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ انسانیت کی اصلی ترقی و فلاح مذہب کے ساتھ وابستہ ہے۔ مذہب کے بغیر انسان بس ایک ترقی یافتہ حیوان ہے جیسا کہ نظریۂ ارتقا کے قائلین کہتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ وہ ایک حیوان ناطق جیسا کہ ارسطو نے انسان کی تعریف کی ہے ہم ان دونوں میں سے کسی تعریف کو بھی انسان کی صحیح تعریف نہیں سمجھتے۔ ہمارے نزدیک انسان ایک روح یزدانی کا حامل ہے جیسا کہ قرآن نے "ونفختُ فیہ من روحی" کے الفاظ سے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ یہی روح یزدانی ہے جو انسان کا شرف خصوصی ہے اور اسی کی بدولت انسان مسجود ملائک بنا ہے۔ یہی روح ملکوتی اگر انسان کی روح بہیمی پر غالب رہے تو انسان حقیقی انسان ہے ورنہ وہ بس دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہے۔ اس روح ملکوتی کے روح بہیمی پر غالب رہنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان کے ارادے کی باگ خدا کی شریعت کے ہاتھ میں ہو اگر انسان کا ارادہ شریعت کے ہاتھ میں نہ ہو اور اس کی عقل خدا کی وحی سے رہنمائی حاصل

ذکر ہے تو جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ کپڑوں میں ملبوس ایک جانور ہے۔ یہ جانور گدھا بھی ہو سکتا ہے کتا بھی ہو سکتا ہے اور بندر اور خنزیر اور ایک خوفناک درندہ بھی ہو سکتا ہے چنانچہ قرآن نے شریعت سے بے قید انسانوں کو مذکورہ تمام جانوروں سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ تشبیہہ محض برائے تشبیہہ نہیں ہے بلکہ اظہار حقیقت ہے۔ اگر ہمارے پاس حقیقت کو دیکھ لینے والی آنکھیں ہوں تو ہم اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ہمارے متمدن شہروں میں کپڑوں میں ملبوس کتنے چوپائے اور درندے انسانوں کے بھیس میں پھر رہے ہیں اور اس صفحۂ ارضی پر قوموں کی قومیں ہیں جو متمدن کہلانے کے باوجود اپنی سرشت کے اعتبار سے درندوں سے زیادہ سفاک اور خونخوار بن گئی ہیں۔

ہمارے لئے شریعت کے انتخاب کا معاملہ بھی کوئی پیچیدہ معاملہ نہیں ہے۔ ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اسلام تمام دنیا کا مشترک دین ہے اور قرآن خدا کی آخری اور کامل کتاب اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری رسول ہیں اس وجہ سے یہ عین ہمارے عقیدے کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی زندگی اسلام کے احکام و ہدایات کے تحت گزاریں اور اسی کی دعوت دوسروں کو بھی دیں۔

یہ دوسروں کو دعوت دینا بھی عین ہماری فطرت بشری کا اقتضاء اور ہماری اپنی اصلاح و ترقی کا لازمہ ہے۔ آپ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ انسان تنہا نہیں پایا جاتا وہ ایک مدنی الطبع ہستی ہے۔ وہ کسی خاندان کے فرد، کسی قبیلہ کے رکن، کسی شہر کے شہری اور کسی ملک کے باشندے کی حیثیت سے پایا جاتا ہے اور اپنی فطری صلاحیتوں کے پروان چڑھنے کے لئے وہ ان سب باتوں کا محتاج ہے۔ اسی بنا پر انسان کو SOCIAL ANIMAL کہا گیا ہے۔ جس طرح مچھلی پانی سے مستغنی نہیں ہو سکتی اسی طرح انسان معاشرے سے مستغنی نہیں ہو سکتا اگر انسان معاشرہ سے بے تعلق ہو کر اپنی صلاحیتوں کو صحیح طور پر اجاگر کر سکتا تو اسلام رہبانیت کی مخالفت نہ کرتا۔ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے نباتات میں سے CREEPERS سے مشابہ ہے۔ جس طرح انگور کی بیل صحیح طور پر اسی طرح پروان چڑھتی ہے جب اس کو کوئی سہارا ملے۔ بغیر اس سہارے کے وہ سکڑ کے رہ جاتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی صحیح طور پر اسی طرح پروان چڑھتا ہے جب اس کو معاشرے کا سہارا ملے۔ بغیر اس سہارے کے اس کی صلاحیتیں سکڑ کے رہ جاتی ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ضروری ہے کہ یہ سہارا اس کے روحانی تقاضوں کے موافق ہو جس طرح انگور کی بیل اس سہارے کے اثرات میں سے حصہ لیتی ہے جس پر وہ چڑھتی ہے اسی طرح انسان اس معاشرے کے خیر و شر سے متاثر ہوتا ہے جس میں زندگی گزارتا ہے۔ انگور کی بیل کو

نیم پر چڑھا دیجئے تو اس کے پھل کڑوے کسیلے ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح انسان اگر بُرے معاشرے میں زندگی گزارے تو وہ بُرا بن سکتا ہے۔

انسان کی اس فطرت نے اس کے لئے ایک سخت مشکل پیدا کر دی ہے۔ ایک طرف تو اس کی فطرت کی رو سے یہ واجب ہے کہ وہ معاشرے سے وابستہ رہے، اس سے بے تعلق نہ ہو۔ دوسری طرف اس پر یہ واجب ہے کہ وہ اپنے لئے سازگار معاشرہ تلاش کرے اور اگر معاشرہ سازگار نہ ہو تو اپنے روحانی و اخلاقی تقاضوں کے لئے پورے اخلاص کے ساتھ اس کو سازگار بنانے کی جد و جہد کرے۔ اگر کوئی شخص یہ جد و جہد نہ کرے تو اس کی اخلاقی و روحانی موت یقینی ہے۔ اگرچہ کوئی شخص کسی دوسرے کی اصلاح پر اختیار نہیں رکھتا۔ دوسرے کی اصلاح اللہ کی توفیق پر منحصر ہے لیکن ہر شخص خود اپنی اصلاح کے لئے اس جد و جہد پر اپنے امکان اور اپنی صلاحیتوں کے حد تک مامور ہے۔

اس وجہ سے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم میں سے جو شخص کوئی بُرائی دیکھے اس پر واجب ہے کہ وہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کرے۔ اگر وہ اس کی قدرت رکھتا ہو اگر ہاتھ سے اس کی اصلاح کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کی کوشش کرے اگر اس کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اگر اس کی صلاحیت بھی نہ رکھتا ہو تو ادنیٰ درجہ کا ایمان یہ ہے کہ اس کو دل سے بُرا جانے (یعنی اس میں کسی نوعیت سے بھی تعاون نہ کرے) اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

معاشرہ سے متعلق افراد کی ذمہ داریوں کو واضح کرنے کے لئے حضور ؐ نے معاشرہ اور افراد کو ایک کشتی کے مسافر سے تشبیہ دی ہے۔ ایک کشتی میں کچھ لوگ اوپر کے حصے پر سفر کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس کے نیچے کے حصے میں۔ فرض کیجئے نیچے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں پانی لینے کے لئے اوپر جانے کی مشقت اٹھانی پڑتی ہے کیوں نہ ہم اپنے حصے میں کشتی کے پیندے میں سوراخ کر لیں اور اوپر والے یہ خیال کرکے کہ وہ اپنے حصہ کی کشتی میں سوراخ کر رہے ہیں ان کو اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سوراخ کرنے کے لئے ان کو آزاد چھوڑ دیں تو سوراخ ہو جانے کے بعد کشتی جو ڈوبے گی تو اوپر والوں اور نیچے والوں سب کو لے کر ڈوبے گی۔ یہی حال معاشرے کا ہے اس میں اچھے بھی ہوتے ہیں بُرے بھی ہوتے ہیں۔ اگر اچھے لوگ معاشرہ کے خیر و شر سے بے تعلق ہو جاتے ہیں تو بُروں کی بُرائی سے جو آفت ظہور میں آتی ہے اس میں اچھے اور بُرے دونوں ہی حصہ پاتے ہیں۔

حدیثوں میں ایک بستی کا ماجرا بھی بیان ہوا ہے جس سے یہ حقیقت مزید واضح ہوتی ہے۔ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کے متعلق فرشتہ کو حکم دیا کہ جاکر اس کو الٹ دو۔ فرشتہ نے عرض کی کہ باری تعالیٰ اس میں تو تیرا ایک ایسا بندہ بھی ہے جو برابر تیری عبادت میں لگا رہتا ہے اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اس کے سمیت بستی کو الٹ دو اس لئے کہ اس کا چہرہ کبھی میرے دین کی بے حرمتی پہ غیرت سے تمتمایا نہیں۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ہمارے لئے اپنے معاشرے کے خیر و شر سے بے تعلق رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے نہ ہماری فطرت اس بے تعلقی کی روا دار ہے نہ ہمارا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے۔ دوسروں کی اصلاح سے قطع نظر ہم خود اپنی اصلاح و فلاح کے لئے اس بات کے محتاج ہیں کہ اپنے معاشرے کو اپنے روحانی و اخلاقی تقاضوں کے لئے سازگار بنانے کی کوشش کریں۔ اس کوشش سے دوسروں کی اصلاح ہو یا نہ ہو لیکن ہماری اصلاح ہو گی۔ اس سے ہماری اپنی صلاحیتیں پروان چڑھیں گی اور ہماری اپنی فطرت کے مضمرات بروئے کار آئیں گے۔ جو شخص یہ کام کرتا ہے وہ خود اپنا فرض انجام دیتا ہے اور دوسروں سے زیادہ وہ خود اپنے اوپر احسان کرتا ہے اس وجہ سے اگر کوئی شخص یہ فرض انجام دیتا ہے تو اس کے لئے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو معاشرہ کا محسن سمجھنے لگے بلکہ وہ یہ سمجھے کہ اس نے اپنا ہی فرض انجام دیا ہے۔ جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں تو کسی پر احسان نہیں کرتے بلکہ خود اپنے اوپر احسان کرتے ہیں اسی طرح اگر ہم معاشرہ کی کسی برائی کی اصلاح کرتے ہیں تو کسی پہ احسان نہیں کرتے بلکہ صرف اپنا فرض ادا کرتے ہیں۔ دین میں دوسروں کے نیک و بد سے متعلق ہم پہ جو ذمہ داری عاید کی گئی ہے وہ ہمارے ذاتی فرض ہی کی حیثیت سے عاید کی گئی ہے۔

زیر بحث قرارداد میں یہ تصور اچھی طرح واضح کر دیا گیا ہے اور اس کے دو بڑے اہم فائدے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ کوئی شخص دعوت و اصلاح کا کوئی کام کرتے ہوئے یہ نہیں سمجھے گا کہ وہ کسی دوسرے کا کام کر رہا ہے بلکہ وہ یہی سمجھے گا کہ اپنا ہی کام کر رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ کوئی شخص دوسروں کی اصلاح میں اتنا مستغرق نہیں ہو گا کہ وہ خود اپنی اصلاح سے غافل اور بے پروا ہو جائے۔ یاد رکھیے کہ میں خود عرض کر چکا ہوں کہ دوسروں کی اصلاح کی کوشش اصلاً خود اپنی ہی اصلاح کی کوشش کا ایک حصہ ہے۔ جو شخص دوسروں کی اصلاح میں رات دن سرگرم ہے لیکن اسے خود اپنی اصلاح کی فکر نہیں ہے وہ محض نمائشی مصلح ہے۔ جو خود بھٹک رہا ہو وہ دوسروں کی رہبری نہیں کر سکتا۔ انگور کی وہ بیل سوکھ جاتی ہے جس کی اپنی جڑ اکھڑی ہوئی ہو اگرچہ اس کو کتنے ہی خوبصورت سہارے

پر چڑھا دیجئے" اس زمانے میں چونکہ زیادہ تر مدعیان اصلاح ایسے ہی ہیں جنہیں خود اپنے دین و ایمان کا کچھ ہوش نہیں لیکن دوسروں میں دین کی سوغات بانٹنے کے لئے خشکی و تری کا سفر کرتے پھرتے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اصل نقطہ پہ لوگوں کی توجہ مرکوز کرائی جائے۔ چنانچہ قرار داد میں اس حقیقت کو یوں واضح کیا گیا ہے کہ "ہمارے نزدیک دین کا اصل مخاطب فرد ہے۔ اسی کی اخلاقی و روحانی تکمیل اور فلاح و نجات دین کا اصل موضوع ہے اور پیش نظر اجتماعیت اصلاً اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ فرد کو اس کے نصب العین یعنی رضائے الٰہی کے حصول میں مدد دے"

اس تصور کا فطرتی مطالبہ یہ ہے کہ اس تنظیم کا ڈھانچہ ایسا بنایا جائے کہ وہ اپنے اعضاء و ارکان کی اصلاح و تربیت کا ایک جامع ادارہ بن جائے اس عزم کا اظہار قرار داد میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے :

"لہٰذا پیش نظر اجتماعیت کی نوعیت ایسی ہونی چاہیئے کہ اس میں فرد کی دینی و اخلاقی تربیت کا کماحقہٗ لحاظ رکھا جائے اور اس امر کا خصوصی اہتمام کیا جائے کہ اس کے تمام شرکا کے دینی جذبات کو جلا حاصل ہو۔ ان کے علم میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے ان کے عقائد کی تصحیح و تطہیر ہو عبادات اور اتباع سنت سے ان کا ذوق و شوق بڑھتا چلا جائے۔ عملی زندگی میں حرام و حلال کے بارے میں ان کی حس تیز اور ان کا عمل زیادہ سے زیادہ مبنی بر تقویٰ ہوتا چلا جائے اور دین کی دعوت و اشاعت اور اس کی نصرت و اقامت کے لئے ان کا جذبہ ترقی کرتا چلا جائے"

ان تمام مقاصد کے حصول کے لئے تنظیم کیا وسائل و ذرائع اختیار کرے گی؟ اس کا جواب دینا بروقت میرے لئے مشکل ہے اس کا جواب بہت کچھ منحصر ہے اس بات پر کہ اس تنظیم کو کن صلاحیتوں کے افراد حاصل ہوتے ہیں اور وہ اپنی مجموعی کوشش سے کیا اسباب و وسائل فراہم کرنے پر قادر ہوتے ہیں۔ افراد اور وسائل کی وسعت کے ساتھ ساتھ امکانات کا جائزہ لینا اور ان کے مطابق تنظیم و تربیت تنظیم کے ارباب حل و عقد کا کام ہے۔ لیکن اتنی بات بدیہی ہے کہ اس مقصد کے بروئے کار لانے میں اس امر کی پوری کوشش کی جائے گی کہ جو قدم بھی اٹھے اسوۂ انبیاء کی روشنی میں اٹھے اور جماعت کی تربیت اس نہج پہ ہو جس کی طرف کتاب و سنت میں رہنمائی کی گئی ہے۔

ہم اپنی تربیت کے لئے سب سے پہلے تو صحیح علم کے محتاج ہیں۔ صحیح علم سے میری مراد دین کا علم ہے۔ اس زمانے میں دین کا علم عنقا ہو رہا ہے اس کے حصول کے لئے وسائل و ذرائع بھی

روز بروز کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں اور لوگوں کے اندر اس کی رغبت بھی بالکل ختم ہوتی جا رہی ہے اگر دین کا علم ہی مٹ گیا تو پھر دین کے باقی رہنے کا کیا امکان ہے؟ یہ امر بھی بدیہی ہے کہ اس زمانے میں دین کا روایتی علم بالکل غیر مفید ہے۔ یہ زمانہ عقلیت کا زمانہ ہے اس زمانہ میں لوگ ہر چیز کی دلیل و حجت کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ مجرد یہ بات لوگوں کو اپیل نہیں کرتی کہ فلاں بات دین کی بات ہے۔ دین پر آج جو اعتراضات ہو رہے ہیں وہ کل کے اعتراضات سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ اعتراضات جدید مغربی فکر و فلسفہ کی پیداوار ہیں اور ان کو نہایت زور و قوت کے ساتھ پھیلانے والے خود ہمارے اندر پیدا ہو گئے ہیں۔ جب تک ان اعتراضات و شبہات کا مؤثر ازالہ نہ ہو اس وقت تک ممکن نہیں ہے کہ آپ دین کی کوئی مفید خدمت انجام دے سکیں۔ افسوس ہے کہ اس خدمت کی صلاحیت رکھنے والے آج ہمارے اندر اگر مفقود نہیں تو اتنے کم ہیں کہ وہ دین کے محاذ کو کسی طرح بھی سنبھال نہیں سکتے۔ اس وجہ سے وقت کی ایک بہت بڑی ضرورت یہ ہے کہ ایسے حاملان دین پیدا کرنے کی مؤثر جد و جہد کی جائے جو جدید علوم و افکار سے بھی کما حقہٗ آگاہ ہوں اور کتاب و سنت کے دلائل و براہین پر بھی وہ براہ راست نظر رکھتے ہوں۔ میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ ہمارا دین دنیا میں بے دلیل نہیں آیا ہے وہ بہتر سے بہتر فطری و عقلی دلائل سے مسلح ہو کر آیا ہے جو ہر دور کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی ہیں، بشرطیکہ ان کو اجاگر کرنے والے اور ان کو دنیا کے سامنے حالات کے مطابق پیش کرنے والے موجود ہوں دوستو! یہ کام کوئی آسان کام نہیں ہے اس قسم کے افراد صرف اردو میں لکھی ہوئی چند کتابیں پڑھ لینے سے نہیں پیدا ہوں گے بلکہ اس کے لئے کتاب و سنت اور علوم اسلامیہ سے براہ راست گہری واقفیت ضروری ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کی صلاحیت ہم میں سے ہر شخص اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتا لیکن معتدبہ تعداد ہمارے اندر جب تک ایسے لوگوں کی نہ ہو گی ہم ان ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآنہ ہو سکیں گے جو دین سے متعلق اس زمانے میں ہم پر عاید ہوتی ہیں۔

جہاں تک عامۃ المسلمین کو دین کی دعوت دینے کا تعلق ہے اس کے بارے میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اس زمانے میں مجرد تذکیر کافی نہیں ہے بلکہ وسیع پیمانے پر تعلیم و تفہیم کی ضرورت ہے۔ یہ صورت نہیں ہے کہ لوگ دین کی باتیں بھولے ہوتے ہیں اگر انہیں یاد دلا دی جائیں تو وہ ان کو اختیار کر لیں گے بلکہ اشاعت باطل کے وسیع ذرائع نے اس زمانے میں تمام اذہان کے اندر بھی دین اور دینی احکام سے متعلق بے شمار غلط فہمیاں بھر دی ہیں جن کو دُور کرنے کا سامان کرنا ان لوگوں پر واجب ہے جو اپنے ملک کے عوام کی اس پہلو سے کوئی خدمت کرنا چاہتے ہوں۔ آج اخبارات

گھر پہنچ رہے ہیں۔ ریڈیو کیسٹوں اور کھیلا نولوں تک میں موجود ہے۔ اس وجہ سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ زندگی جدید شیطانی نظریات سے ہمارے عوام بے خبر ہیں یا وہ ان سے بالکل بے تعلق ہیں۔ ان سے تاثر کے ملے ہیں شہری اور دیہاتی آبادی میں کچھ فرق ہونا تو ایک قدرتی امر ہے لیکن دیہاتی آبادی کو ان نوں سے بالکل الگ تھلگ خیال کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان کے اندر کام کرنے کے وہ طریقے یار کرنے ہوں گے جو موجودہ حالات میں ان کے لئے مؤثر اور مفید ہوں۔

جہاں تک ملک کے ارباب اقتدار کا تعلق ہے ان کے بارے میں بھی ہمارے ہاں سخت افراط و یط پائی جاتی ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو ان کی اصلاح کے معاملے میں بالکل بے تعلق ہیں انہیں کے خیر و شر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

دوسرے وہ لوگ ہیں جو ان کے شر کو بھی خیر ہی کہنا پسند کرتے ہیں۔

تیسرے وہ لوگ ہیں جو ان کے خیر کو بھی شر قرار دیتے ہیں اور ہر حالت میں ان کی مخالفت تا ان کے ہاں جزو ایمان ہے۔

آپ کی یہ قرارداد ان تینوں طریقوں کو غلط قرار دیتی ہے اور دین کی روشنی میں ایک چوتھا یقہ آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔

جہاں تک پہلے طریقے یعنی لاتعلقی کے رویہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ یں ض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کوئی ہمارا جھگڑا نہیں ہے جس سے مدہ رہنے میں آدمی کے لئے سعادت ہو بلکہ ہم میں سے ہر شخص کے اپنے دین و ایمان کا معاملہ ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح تعلیمات کی روشنی میں بتا چکا ہوں کہ جو شخص معاشرہ کے خیر و شر بے پرواہ ہے وہ خود اپنے دین و ایمان سے بے پرواہ ہے اور اس کی یہ بے پرواہی اس کی ساری ن داری کو غارت کر کے رکھ دے گی۔ ہم جس کشتی پر سوار ہیں اپنے امکان کی حد تک کسی کو اس بیندے میں سوراخ کرتے ایک تماشائی کی طرح نہیں دیکھ سکتے۔

دوسرے گروہ کا رویہ بھی بالکل غلط ہے جو چیز غلط ہے اگر وہ ارباب اقتدار کی طرف سے ظہور ، آئے تو اس کی غلطی اور بھی سنگین ہو جاتی ہے اس لئے کہ اس کے اثرات بہت دور رس ہوں ۔ اگر کوئی شخص اس غلطی کو ثواب قرار دے تو یہ اس پر خاموش رہنے سے بھی بڑا جرم ہے یہ رویہ ر خوف یا طمع کی بنا پر اختیار کیا جائے تو یہ اسلام میں صریح نفاق ہے جو ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔ ر اگر یہ اس بنیاد پر اختیار کیا جائے کہ اس سے حکومت کو ضعف پہنچتا ہے تو یہ بھی غلط ہے اول تو

حکومت کو ضعف پہنچ سکتا ہے تو غلط چیز سے نہ کہ صحیح چیز سے، ثانیاً حکومت بجائے خود مقصد و غایہ نہیں ہے بلکہ اسلام میں وہ اللہ کے قانون عدل و قسط کا ذریعہ ہے اس وجہ سے حکومت کی مصلحت کے لئے بھی کسی شر کو خیر قرار دینا اپنے دین و ایمان پر کلہاڑی مارنا ہے۔

تیسرے گروہ کا رویہ بھی بالکل غلط ہے ارباب اقتدار کی ہر بات کو بدف تنقید بنا لینا یہاں تک کہ ان کے خیر کو بھی شر قرار دینا اور اس مخالفت میں اس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی برائیاں بھی ان کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل و منطق کی رو سے جائز ہے نہ اسلام کی رو سے۔ یہ اقتدار کی ہوا میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے اور اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی صحیح بات بھی ارباب اقتدار کو اپیل نہیں کرتی۔ جن لوگوں کی ذہنیت یہ بن جاتی ہے وہ خیر خواہی کے جذبے سے بالکل خالی ہو جاتے ہیں۔ درآں حالیکہ یہ جذبہ دعوت دین کی اصل روح ہے۔ اگر انسان خیر خواہی کے جذبے سے خالی ہو تو اس کی ہر بات نفرت اور عناد کی تخم ریزی کرتی ہے اور اگر وہ اس کے ساتھ دین کا نام لیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین کو بھی لوگوں کی نگاہوں میں ایک نفرت انگیز چیز بنانا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں دین کو جو نقصان پہنچا ہے وہ دین کے کھلے ہوئے دشمنوں کے ہاتھوں بھی نہیں پہنچا ہے اس لئے کہ یہ لوگ اپنی ایک نفسیاتی جنگ میں دین کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اس طرح بلاوجہ دین کو ان تمام لوگوں کے سامنے ایک حریف بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں جن سے ان کی لڑائی ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس طرح کے لوگ انسانیت اور خلق کی محبت سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دل سے اس بات کے آرزومند ہوتے ہیں کہ ملک میں زلزلے آئیں، قحط پڑے، سیلاب آئیں، وبائیں پھیلیں تاکہ یہ ان سب چیزوں کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرا کر اپنے اقتدار کے لئے راہ ہموار کریں۔ ایسے بے درد اور سنگ دل لوگوں سے یہ توقع رکھنا کہ یہ دین کی کوئی خدمت انجام دے سکیں گے محض خام خیالی ہے۔

آپ نے جو قرارداد پاس کی ہے اس میں آپ نے ان تمام طریقوں سے الگ اپنے لئے "الدین النصیحہ" کی راہ اختیار کی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ لوگوں کے خیر و شر سے بے نیاز نہیں ہو سکتے اس لئے کہ یہ خیر خواہی کے خلاف ہے۔ اسی طرح آپ کسی کے شر کو خیر بھی نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ یہ بھی حق اور خیر خواہی کے خلاف ہے۔ علیٰ ہذا القیاس آپ کسی کی مخالفت کے جوش میں اس کی نیکی کو بدی نہیں ٹھہرا سکتے اس لئے کہ یہ بھی سچائی اور خیر خواہی کے خلاف ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ دین کو ہوس اقتدار کی جنگ میں ایک ہتھیار کے طور پر کبھی استعمال نہیں کریں گے بلکہ جس کے سامنے

بھی اس کو پیش کریں گے اللہ کے دین کی حیثیت سے پیش کریں گے کہ اسی میں اس کی بھی بھلائی ہے اور اسی میں آپ کی بھی بھلائی ہے۔ یہی حضرات انبیاء علیہم السلام کا طریق کار ہے اور یہی آپ کو اختیار کرنا ہے۔

رفیقو! میں سمجھتا ہوں کہ ایک واضح چیز کی وضاحت کرنے میں آپ کا بہت سا وقت میں نے لیا۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور اپنے لئے اور آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ ہم نے جو کچھ طے کیا ہے اس پر ہم عمل کرنے کی توفیق پائیں۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات!

عَنْ اَبِیْ رُقَیَّۃَ تَمِیْمِ بْنِ اَوْسِ الدَّارِمِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ

اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ:

"اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ"

قُلْنَا "لِمَنْ؟" ——— قَالَ

"لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِاَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِہِمْ" (رواہ مسلم)

ترجمہ: ———

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دین تو بس وفاداری اور خیر خواہی کا نام ہے" صحابہ رضؓ نے پوچھا: "حضورؐ! کس کی"؟ آپؐ نے فرمایا "اللہ کی، اس کی کتاب کی، اس کے رسول کی اور مسلمانوں کے رہنماؤں اور عوام سب کی!"

تقریر مولانا عبدالغفار حسن

حمد و ثنا کے بعد

رفقائے محترم!

صبح کے درسِ قرآن، پھر قرارداد اور اس کی توضیح اور سب سے بڑھ کر مولانا اصلاحی کی تقریر سے معاملے کے اکثر پہلو اچھی طرح واضح ہو چکے ہیں اور اب میری تقریر کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی، تاہم جو خدمت میرے سپرد ہے میں اس کی انجام دہی میں بعض باتیں آپ حضرات کے سامنے رکھتا ہوں تکرار سے بھی کم از کم تذکیر کا فائدہ تو حاصل ہو ہی جائے گا۔

ایک نئی دینی جماعت کے قیام کے فیصلے پر سب سے پہلے جو سوال ذہنوں میں پیدا ہونا لازمی ہے وہ یہ ہے کہ آخر ایک نئی جماعت کی ضرورت کیا ہے؟ اوّلاً کیا انفرادی طور پر کام کرنا کافی نہیں ہے؟ ثانیاً اگر اجتماعیت لازمی ہے تو بھی ڈیڑھ اینٹ کی ایک نئی مسجد الگ بنانے کی کیا حاجت ہے؟ بہت سی دینی تنظیمیں اور جماعتیں موجود ہیں کیوں نہ ان میں سے کسی کے ساتھ شامل ہو کر کام کیا جائے؟

جہاں تک اجتماعیت کی ضرورت و اہمیت کا تعلق ہے اس پر مولانا اصلاحی بہت مفصل روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہ بدیہی بات ہے کہ بہت سے لوگوں کے علیحدہ علیحدہ کام کرنے اور ان سب کے مل کر اجتماعی طور پر کام کرنے میں نتائج کے اعتبار سے زمین آسمان کا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اجتماعیت میں ہر فرد ایک دوسرے کا سہارا اور ایک دوسرے کی کمی پورا کرنے والا ہوتا ہے جس کے کام میں عظیم برکت پیدا ہوتی ہے — ظاہر بات ہے کہ اللہ نے مختلف لوگوں کو مختلف صلاحیتیں دی ہیں۔ کسی کو بولنے کی صلاحیت دی ہے، کسی کو لکھنے کی، کسی کو بھاگ دوڑ کی قوت دی ہے، کسی کو غور فکر اور تدبّر و تفکّر کی — اسی طرح کسی کو علوم دینی سے سرفراز فرمایا ہے اور کسی کو معلومات دنیوی سے بہرہ ور فرمایا ہے۔ کسی کو فہم قرآن کے بحرِ عمیق میں غوطے لگانے کی صلاحیت دی ہے تو کسی کو علوم حدیث کی وسعتوں میں پیرائی کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ کسی کو قدیم کی واقفیت عطا فرمائی ہے تو کسی کو جدید سے روشناس کیا ہے۔ مختلف صلاحیتوں اور قوتوں سے مسلح افراد کے مجتمع اور متحد ہو کر کام کرنے سے ہی اس بات کی توقع کی جا سکتی ہے کہ کوئی جامع اور ہمہ گیر نوعیت کا کام سرانجام پا سکے

پھر دین و مذہب کے مخالف اور لادینیت کے علمبرداروں کو دیکھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری طرح منظم ہو کر کام کر رہے ہیں اور ان کے مختلف گروہ اور جتھے مختلف اطراف سے پوری تنظیم اور اجتماعیت کے ساتھ دینی قوتوں پر یلغار کر رہے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اجتماعیت کا مقابلہ انفرادیت سے نہیں کیا جا سکتا اس کے لئے اجتماعیت ہی کی ضرورت ہے۔ بنابریں دینی قوتوں کا منظم و مجتمع ہونا ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

بلاشبہ جماعت سازی سے کچھ اندیشے بھی لاحق ہوتے ہیں مثلاً ایک[1] یہ کہ اس سے جماعتی و گروہی عصبیت پھر تعصب اور بالآخر تحزب و تفرق کی لعنت وجود میں آتی ہے۔ دوسرے[2] یہ کہ جماعتیں بالعموم شخصیتوں کے گرد گھومتی ہیں اور ان سے شخصیت پرستی کی مہلک بیماری پیدا ہوتی ہے۔ تیسرے[3] یہ کہ خود جماعتیں عموماً داخلی انتشار کا شکار ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات اس سے انتہائی کریہہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

اس سلسلے میں اوّلین بات تو یہ ہے کہ ہر چیز کے مجموعی فائدے یا نقصان کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ بہت سے اچھے کاموں میں کوئی پہلو برائی کا ہو سکتا ہے اور بہت سی برائیوں میں کوئی پہلو اچھائی کا ہونا ممکن ہے۔ قرآن مجید نے خود شراب اور جوئے کے بارے میں بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ ان میں منفعت بھی ممکن ہے لیکن وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ان کا شر ان کی منفعت سے زیادہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز میں خیر کا پہلو غالب ہو اس کو اختیار کرنا چاہیئے اور اس کے شر سے بچاؤ کی ہر ممکن تدبیر کرنی چاہیئے۔

"شخصیت پرستی" کی لعنت کے پیدا ہونے کے امکانات وہاں زیادہ ہوتے ہیں جہاں کسی ایک داعی کی دعوت پر لوگ جمع ہوں اور اسی کے خیالات و نظریات و تصوّرات اور اسی کے فہم و فکر کو اس اجتماعیت میں مرکز و محور کی حیثیت حاصل ہو جائے۔ اس کے برعکس اگر ابتدا سے بہت سے لوگ باہمی مشاورت سے اپنے مقصد اور اس کے حصول کے طریق کو طے کریں اور مسلسل "اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" کی قرآنی ہدایت پر عمل پیرا رہیں تو انشاءاللہ اس لعنت کا سدباب ہو جائے گا۔

"تحزب اور تفرق" سے بچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ دین کی خدمت کے لئے جمع ہونے والے لوگ ہمیشہ اننا من المسلمین ہی کو اپنا واقعی شعار بنائیں اور اپنے آپ کو امّت مسلمہ ہی کا ایک حصّہ تصوّر کریں۔ چنانچہ نہ ان میں کوئی غرور و گھمنڈ پیدا ہو نہ اپنے "چیزے دگر" ہونے کا احساس پیدا ہونے پائے اور نہ ہی وہ اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے کسی اعتبار سے بہتر و برتر تصوّر کریں۔

یہاں یہ حقیقت بھی نگاہ میں رہنی چاہیئے کہ تحزب اور تفرق محض جماعت سازی ہی سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ کوئی ادارہ یا محض درس گاہ یا دارالعلوم بھی ان کا سبب بن سکتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ بنا ہے اور اس کی مثالیں خود ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو درس گاہ نئی قائم ہوتی ہے وہ بالعموم کسی ایک خصوصیت کی حامل ہوتی ہے، نتیجۃً اس سے فارغ ہونے والے نوجوانوں کا مزاج ایک خاص رنگ میں ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے اور مرورِ ایام کے ساتھ اس کے فارغین و متوسلین میں گروہی و حزبی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب نہ تو یہ صحیح ہے کہ ان خدشات کی بنا پر درس گاہیں اور دارالعلوم قائم کرنے بند کر دیئے جائیں اور نہ یہ صحیح ہے کہ دینی مقاصد کے حصول کے لئے ادارے یا جماعتیں قائم کرنا ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اس کے برعکس دارالعلوموں اور اداروں کے قیام کے ساتھ حتی الامکان ایسی احتیاطی تدابیر اختیار کی جانی چاہییں کہ ان کے ذریعے امت میں تفرقہ و انتشار پیدا نہ ہو۔ اس سلسلے میں جس قدر میں نے غور کیا ہے میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک تو جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے لوگوں میں کچھ "چیزے دگر" ہونے کے احساس کو پیدا ہونے سے روکا جائے اور "اننی من المسلمین" کی قرآنی ہدایت کو ہمیشہ مستحضر رکھا جائے اور دوسرے یہ احتیاط کی جائے کہ عملاً جمعہ و جماعت اور ربط و ضبط اور رشتوں ناطوں کے معاملات کو صرف ہم خیال لوگوں کے حلقے میں محدود کرنے کا رجحان نہ پیدا ہو ——— ان تدابیر پہ اگر عمل کیا جائے تو میری رائے میں کوئی دینی جماعت فرقے میں تبدیل نہیں ہوگی ——— واللہ اعلم!

تیسرا اندیشہ جماعتوں کے 'داخلی انتشار' کا ہے تو اگرچہ ماضی کے کچھ تلخ تجربات کی روشنی میں واقعۃً اس اندیشے سے طبیعت میں بہت زیادہ توحش پیدا ہوتا ہے تاہم یہ حقیقت بادنیٰ تامل سامنے آ جاتی ہے کہ محض اس اندیشے کی بنا پہ اجتماعی جدوجہد سے باز رہنا ہرگز ایک معقول بات نہیں ہے۔ اختلاف اس عالم واقعہ کی ایک عظیم (اگرچہ تلخ) حقیقت ہے' ——— 'لا یزالون مختلفین اِلَّا مَن رَّحِمَ رَبُّکَ' تحریکیں اٹھتی ہیں اور بہت کچھ مفید کام کرتی ہیں پھر ان میں داخلی انتشار رونما ہو جاتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ آپ اپنے خنجر سے خودکشی کر لیتی ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ ان کا کام نسیًا منسیًا ہو جاتا ہے ان کے اثرات ان کے بہت بعد تک بھی باقی رہتے ہیں ——— لہٰذا ضرورت اس کی ہے کہ خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ کام شروع کیا جائے۔ اختلافات کے حل کے لئے صحت مند راستے حتی الامکان کھلے رکھے جائیں۔ اس کے بعد بھی کبھی ناگوار صورت حال پیدا ہو تو اس کا سامنا کیا جائے۔

اب دوسرے سوال کو لیجئے ——— یعنی یہ کہ آخر ایک نئی جماعت کا قیام ہی کیوں ضروری ہے؟ کیوں نہ موجود الوقت دینی جماعتوں میں سے کسی کے ساتھ مل کر کام کیا جائے؟

اس سوال کا سادہ سا جواب تو یہ ہے کہ جس طرح ملک میں بہت سی درس گاہوں اور دارالعلوموں کے وجود سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی نئی درس گاہ قائم نہ کی جائے اسی طرح بہت سی دینی جماعتوں کا وجود کسی نئی جماعت کے قیام کی نفی نہیں کرتا اور جس طرح ایک نئے دارالعلوم کے موسسین کے بارے میں لازماً یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ان کی رائے بقیہ درس گاہوں کے بارے میں بہت بری ہے اس طرح ایک نئی دینی جماعت کے مؤسسین کے بارے میں یہ سمجھنا کہ یہ لازماً دوسری دینی جماعتوں کے بارے میں بہت بری یا حقارت آمیز رائے رکھتے ہیں درست نہیں ہے۔

مزید وضاحت کے لئے عرض ہے کہ اس وقت جو جماعتیں ملک میں بالفعل موجود ہیں ہمارے نقطہ نظر سے ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن سے ہمیں کلی اختلاف ہے یعنی ان کے طریق کار اور ان کے مزاج اور ذہن کو ہم درست نہیں سمجھتے۔ ایسی جماعتوں میں مدغم ہونے یا ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ——— دوسری جماعتیں ایسی ہیں جو ہماری رائے میں بعض کام بہت اچھے سرانجام دے رہی ہیں لیکن ان کے کاموں میں کچھ خلا ہے اور دین کے بعض تقاضے اس کے ذریعے پورے نہیں ہو رہے ہیں ——— ایسی جماعتوں کے ساتھ دو طرح کا معاملہ نظری اعتبار سے ممکن ہے۔ ایک یہ کہ ان کے ساتھ شامل ہو کر کام کیا جائے اور ان کے اندر رہ کر زور ڈالا جائے کہ دین کے دوسرے تقاضوں کو بھی پورا کیا جائے۔ یہ طریق بظاہر بڑا معقول اور مستحسن نظر آتا ہے لیکن عملاً اپنے اندر بہت سی پیچیدگیاں رکھتا ہے۔ ہر جماعت کے موسسین کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اور ان کے ذہن کی ایک خاص ساخت ہوتی ہے جسے بآسانی بدلا نہیں جا سکتا، اور اگر بدلنے کی کوشش کی جائے تو اس کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کہ خواہ مخواہ کی کھینچ تان اور بدمزگی پیدا ہو اور ہاتھ کچھ نہ آئے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر ان کے نزدیک کوئی دوسرا پہلو اہم تر ہے تو وہ آپ کی وجہ سے کسی اور پہلو پر کیوں زیادہ زور دیں لہٰذا عملاً دوسرا طریق ہی ممکن العمل بھی ہے اور بہتر بھی یعنی یہ کہ دوسرے لوگ ایک علیحدہ اجتماعیت قائم کریں اور اپنے ذہن و فکر اور اپنے عوائد کے مطابق کام کریں ——— اب تو اگر خلوص اور للّٰہیت موجود ہے تو یہ دونوں کام ایک دوسرے کے معاون اور ایک دوسرے کی کمی کو پورا کرنے والے بن جائیں گے اور اگر اخلاص کی دولت ہی سے ہاتھ دامنی ہو تو پھر بھی زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ جیسا تصادم اندر تھا ویسا ہی

باہر بھی ہوگا۔ اس صورت میں بھی علیحدہ جماعت سازی پہلی صورت کے مقابلے میں زیادہ نقصان دہ تو کسی طرح نہیں ہو سکتی ——— !

اب میں آپ کے سامنے اس نئی دینی تنظیم کے کچھ خصائص پیش کروں گا۔ جس کے قیام کے لئے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ان کا تذکرہ قرارداد میں بھی ہے اور ان کی توضیحات میں بھی۔ پھر مولانا اصلاحی بھی اپنی تقریر میں ان میں سے بعض کی وضاحت کر چکے ہیں۔ میں ان کو سلسلہ وار پیش کرتا ہوں تاکہ جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کم از کم تذکیر ہو جائے :-

پہلی خصوصیت ہماری پیش نظر تنظیم کی یہ ہے کہ اس میں نصب العین کے مقام پر صرف نجات اور رضائے الٰہی کے حصول کو رکھا گیا ہے اور اس میں ایسی کوئی تفریق نہیں رکھی گئی کہ دنیا میں ہمارا مقصود یہ ہے اور آخرت میں یہ ! ——— دنیا دار العمل ہے اور آخرت دارِ جزا۔ دنیا میں انسان دین و شریعت کے جملہ تقاضوں کو اخروی جزا ہی کے لئے پورا کرتا ہے لہٰذا ہر آن اور ہر لمحہ ہمارا نصب العین ایک ہی ہے اور وہ ہے آخرت کی کامیابی !! اور اس کے لئے دین کے جملہ انفرادی و اجتماعی تقاضوں کو اسی ترتیب و تدریج اور تقدیم و تاخیر کے ساتھ پورا کرنا ضروری ہے جو خود نظام دین میں متعین ہے ! ان میں سے کسی ایک تقاضے کو اہمیت دے کر ’نصب العین‘ کے مقام پر لے آنا ہرگز صحیح نہیں ہے !

دوسری خصوصیت ہماری اس تنظیم کی یہ ہوگی کہ ہماری دعوت صرف اللہ اور اس کے دین کی طرف ہوگی نہ کسی خاص شخصیت یا جماعت کی طرف ہوگی نہ کسی خاص مسلک یا فقہی مذہب کی طرف !

اسی بنا پر اس اجتماعیت کی تیسری خصوصیت یہ ہوگی کہ یہ نہ کسی فرد یا گروہ کی حلیف ہوگی نہ حریف۔ اس میں حُبّ اور بغض اور محبت و نفرت کا معیار صرف اللہ اور اس کا دین ہوں گے اور یہ " کُونُوا قَوّٰامِینَ بِالْقِسْطِ شُھَدَاءَ لِلّٰہِ " کے قرآنی حکم پر عمل پیرا ہونے کی مقدور بھر سعی کرے گی اور حتی الامکان کوشش کرے گی کہ ذاتی یا گروہی عصبیت یا تعصب کی بنا پر عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے (لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ؗ) چنانچہ ہمارے لئے کسی حزبِ اختلاف کا تصور خارج از بحث ہوگا ——— مغربی جمہوریت کے پیدا کردہ ان تصورات سے عدل و انصاف کے تقاضے پامال ہو جاتے ہیں اور انسان اپنی جماعت کے بُرے سے بُرے کام کی حمایت اور حزبِ مخالف کے اچھے سے اچھے کام کی مخالفت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پیش نظر

اسلامی تنظیم انشاء اللہ تعاونوا علی البرّ والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان کے قرآنی احکامات پر عمل پیرا ہوگی۔

چوتھی خصوصیت ہماری اس اسلامی تنظیم کی یہ ہوگی کہ یہ طبقاتی تصور اور اس سے پیدا شدہ تنازع للبقا کے بجائے وحدتِ الٰہ و آدم اور توافق یا تعاون للبقا کے تصور کو اجاگر کرنے کی کوشش کرے گی۔

پانچویں خصوصیت دینی مسائل اور ان سے متعلق اختلاف مذاہب و مسالک کے متعلق ہے۔ ہمارے نزدیک جملہ دینی مسائل تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو اساسی اور بنیادی بھی ہیں اور متفق علیہ بھی، دوسرے وہ جو متفق علیہ تو ہیں لیکن اساسی نہیں ہیں۔ اور تیسرے، وہ مسائل ہیں جن میں سلف اور خیر القرون ہی سے اختلاف چلا آرہا ہے۔ ہماری یہ تنظیم انشاء اللہ اپنی اصل توجہ کا مرکز و محور پہلی قسم کے مسائل ہی کو بنائے گی۔ اس لئے بھی کہ فی الواقع وہی اساسی اور بنیادی ہیں اور اس لئے بھی کہ موجودہ دور کے فتنوں کی زد دراصل ان ہی پر پڑ رہی ہے، یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسالت، اور ایمان بالآخرت ہی خطرے میں پڑ گئے ہیں لہٰذا اس وقت اصل ضرورت ان کے استحکام کی ہے، اور ان کے معاملے میں کسی قسم کی رواداری اور مداہنت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ دعوت میں نرمی اور حکمت تبلیغ بالکل دوسری چیز ہے اور مداہنت فی الدین بالکل دوسری۔ ان معاملات میں مصلحت کی بنا پر رواداری ممکن نہیں ہے ——— البتہ تیسری قسم کے مسائل میں تشدد اور غلو کسی طرح جائز نہیں ہے۔ ان میں بھی مذاکرہ اور باہمی تبادلہ خیال ہو سکتا ہے لیکن کسی ایک رائے یا مسلک کو بالجبر دوسروں پر ٹھونسنا کسی صورت میں درست نہیں۔ ہم اپنی اجتماعیت میں ایک ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں گے جس میں ان اختلافی مسائل کے بارے میں انتہائی رواداری اور فراخ دلی پائی جائے۔

چھٹی خصوصیت جو قرار داد میں صراحت کے ساتھ مذکور ہو چکی ہے یہ ہے کہ اس میں "الاھم فالاھم" کا اصول پیش نظر رکھا جائے گا اور تبلیغ و دعوت میں تدریج ملحوظ رہے گی ——— یہ تمام معاملات احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بصراحت مذکور ہیں۔

ساتویں خصوصیت اس اجتماعیت کی جیسا کہ قرار داد سے واضح ہے یہ ہوگی کہ اس کا دائرہ کار صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہے گا بلکہ غیر مسلم بھی اس کے مخاطب ہوں گے۔ مسلمانوں کی خامیوں کی اصلاح بھی ہمارے فرائض دینی میں شامل ہے اور غیر مسلموں تک اسلام کی تبلیغ اور ان پر

رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اتمام حجت بھی ہماری دینی ذمہ داریوں میں سے ہے ہماری یہ اسلامی تنظیم انشاء اللہ اس ضمن میں بھی اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے کوشاں ہوگی۔

پیش نظر تنظیم کی متذکرہ بالا خصوصیات تو وہ ہیں جو ہمارے مابین متفق علیہ ہیں اور ہماری قرار دادیں صراحتہً یا دلالتہً مذکور ہیں۔ اب میں بعض ایسی خصوصیات کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو میری ذاتی رائے میں ہمیں اختیار کرنی چاہییں۔ ان میں اختلاف کی گنجائش تو ہے لیکن مجھے امید ہے کہ ان میں سے اکثر کو آپ حضرات اپنے دل ہی کی آواز محسوس کریں گے۔

ان میں سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ہمیں اذکار و اوراد کے معاملے میں یہ اصول متعین کر لینا چاہیئے کہ ہم ادراد و وظائف اور اذکار و ادعیہ میں سے صرف ان کو اختیار کریں جو خدا کی کتاب یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ماخوذ ہوں ان کا اوّلین فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہم خدا اور رسول کے ساتھ جڑے رہیں گے اور اس سے یقیناً ایک عظیم روحانی فائدہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی اس سے افتراق و انتشار میں بھی کمی ہوگی۔ مختلف لوگ اپنے ذوق کے اعتبار سے مختلف اذکار اختیار کر لیں تو رفتہ رفتہ یہی ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت بن جاتے ہیں اور اس سے ایک علیحدگی کا احساس پیدا ہو سکتا ہے لہٰذا اس اعتبار سے بھی عافیت اسی میں ہے کہ صرف مسنون و ماثور ادعیہ و اذکار پہ اکتفا کیا جائے۔

دوسری یہ کہ مثبت اور منفی دونوں کام سامنے رکھے جائیں۔ دین میں معروف کے امر کے ساتھ منکر کی نہی کا بھی حکم دیا گیا ہے اور احقاق حق کے ساتھ ابطال باطل کو بھی لازم ٹھہرایا گیا ہے، آجکل جو عام خیال پھیل گیا ہے کہ صرف مثبت کام کرنا چاہیئے منفی کام نہیں کرنا چاہیئے تو یہ میری ذاتی رائے میں ازروئے دین درست نہیں ہے ——— دعوت کا اچھے سے اچھا اسلوب اختیار کرنا اور حکمت تبلیغ کو پیش نظر رکھنا بالکل دوسری بات ہے اور انکار منکر اور ابطال باطل سے قطعاً صرف نظر کر کے صرف "مثبت" باتوں کو پیش کرتے رہنا بالکل دوسری چیز ہے اور دینی غیرت و حمیت کا لازمی تقاضا میرے نزدیک یہ ہے کہ خلاف دین و شرع امور پر برملا تنقید کی جائے، چاہے اس کا ہدف اصحاب اقتدار بنتے ہوں چاہے عوام۔ اس معاملے میں یہ پہلو بھی لائق توجہ ہے کہ آجکل حکومت کی خلاف مذہب باتوں پہ تنقید کرنے والے تو پھر بھی مل جاتے ہیں۔ عوام کو ان کی خلاف دین باتوں پہ ٹوکنے والا کوئی نہیں رہا جبکہ میری ذاتی رائے میں آج کے زمانے میں عوام کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کبھی سلاطین و امراء کو حاصل تھی اور اس اعتبار سے ان کی نظری و عملی

گمراہیوں اور ضلالتوں پر تنقید بھی "افضل الجہاد" کے حکم میں داخل ہو گئی ہے۔

تیسرے یہ کہ جاہلیت قدیم اور جاہلیت جدیدہ دونوں کا ابطال کیا جائے۔ یہ تو ہو سکتا ہے بلکہ غالباً یہی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ جاہلیت قدیمہ کی بیخ کنی کی صلاحیت و قدرت سے مسلح ہوں اور کچھ دوسرے لوگ جاہلیت جدیدہ کے استیصال کی قدرت و طاقت رکھیں۔ چنانچہ انہیں اپنے اپنے محاذوں پر کام کرنا ہوگا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ یہ دونوں محاذ پیش نظر رہیں اور کسی سے صرف نظر نہ ہونے پائے۔

چوتھی کوشش پیش نظر تنظیم اسلامی میں اس امر کی ہونی چاہیئے کہ نہ تو نری عقلیت پر انحصار کیا جائے اور نہ ہی نری جذباتیت پر دار و مدار ہو بلکہ عقل اور جذبے دونوں کو مناسب مقام پر رکھ کر کام کیا جائے جو بات کہی جائے وہ صرف عقل ہی نہ ہو بلکہ دل سے بھی نکلے تاکہ اس کے مخاطب اہل عقل بھی ہوں اور صاحبان دل بھی۔ اور دعوت خود اہل عقل کے بھی دل میں گھر کر جائے!!

پانچویں لازمی چیز جس کا پورا اہتمام ہماری اس تنظیم میں کیا جانا چاہیئے یہ ہے کہ اس میں تنقید پر کوئی پہرا نہ لگایا جائے اور ایسی کوئی پابندی نہ لگائی جائے جس سے لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں تنقید کے صحیح اسلامی آداب کی پابندی تو یقیناً لازم ہے لیکن تنقید کے دروازوں کو بند کر دینا پیش نظر تنظیم کی پیشگی ہلاکت کا سامان ہوگا۔ اس تنظیم کے ارباب حل وعقد کا تنقید کو برداشت کرنے کی ہمت و صلاحیت سے مسلح ہونا ضروری ہے ——— اس کے ساتھ ہی یہ بھی لازمی ہے کہ پیش نظر تنظیم کا نظام شورائی ہو اور قرآن حکیم کی اس ہدایت کہ " وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ " کا جیتا جاگتا نمونہ ہو۔

چھٹی خصوصیت ہماری اجتماعیت کی یہ ہونی چاہیئے کہ اس میں زہد خشک اور تفریح بے قید کے مابین درمیانی کیفیت پیدا ہو اور نہ تو عبوسًا قمطریرا کا نقشہ پیدا ہو جائے نہ دوسری انتہا ہو کہ ہر وقت ہنسی دل لگی اور تفریح کا ماحول طاری رہے۔

اسی طرح "رہبانیت" اور "تنعم" کے مابین درمیانی کیفیت کا پیدا کرنا بھی لازمی ہے۔ دین میں نہ قطعی ترکِ لذائذ کی ترغیب ہے اور نہ عیش پرستی کی گنجائش ہے۔ اللہ کی نعمتوں سے جائز طریقے سے متمتع ہونے کو برا سمجھنا بھی دین کی روح کے منافی ہے اور عیش کوشی بھی از روئے دین ممنوع ہے۔

ساتویں ضروری چیز جو قرارداد کی توضیح میں بہت وضاحت کے ساتھ آچکی ہے کہ انتظامی اور

تنظیمی امور میں دلچسپی کے ساتھ اسی درجہ کا گہرا شغف تعبدی امور میں ہونا لازمی ہے ورنہ بالکل یک رُخی شخصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کی بدولت دینی تنظیموں میں بہت سی خرابیاں رونما ہو جاتی ہیں۔ پیش نظر تنظیم میں انشاء اللہ اس امر کی خصوصی نگہداشت کی جائے گی۔

آٹھویں اور آخری ضروری چیز یہ ہے کہ اپنے زمانے کے مخصوص فتنوں کا صحیح فہم اور ان کی اہمیت کا صحیح شعور حاصل کیا جائے۔ اس معاملے میں دین کے خادموں کو بالکل ماہر تشخیص طبیب کے مانند ہونا چاہیئے تاکہ وہ اپنے اپنے زمانے کی اصل اور بنیادی بیماریوں کی صحیح تشخیص کر سکیں۔ بصورت دیگر یہ ہو سکتا ہے اور بسا اوقات ہوتا ہے کہ ساری جد و جہد علامات کے خلاف ہوتی رہتی ہے۔ اور بیماری کی اصل جڑ جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگاہِ حقیقت بیں نے بالکل صحیح اندازہ کر لیا تھا کہ منع زکوٰۃ وغیرہ جیسے بظاہر 'فروعی' معاملات کی تہہ میں اصل مرض کون سا کام کر رہا ہے۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز کی نگاہِ دور رس نے بھی اپنے وقت کے فتنے کا صحیح صحیح اندازہ کر لیا تھا پھر ان کے بعد بھی تمام مجددین اپنے اپنے دور کے فتنوں کی اہمیت کا اندازہ کر کے ان کے سدباب کی سعی کرتے رہے۔ فجزاھم اللہ خیرا لجزاء عن جمیع المسلمین۔ اپنے وقت کے امراض کی صحیح تشخیص کے لئے بڑی گہری بصیرت کی ضرورت ہے اور یہ چیز درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سے ہوتی ہے۔ تاہم اپنے مقدور بھر اس امر کی سعی ضروری ہے کہ کسی ایک ہی بنی ہوئی راہ پر چلتے رہنے کے بجائے اس پر مسلسل غور و فکر اور تفکر و تدبر کیا جاتا رہے کہ ہمارے زمانے کے اصل فتنے کون سے ہیں اور ان کے سدباب کی صحیح راہ کون سی ہے۔

آخر میں ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر کے اپنی معروضات کو ختم کرتا ہوں کہ جو کام کرنے کا عزم ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے کیا ہے وہ بیک وقت آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس اعتبار سے کہ یہ ہمارے دین کا تقاضہ، ہماری فطرت کی پکار اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے پروردگار کی جانب سے عاید کردہ فرض ہے۔ لہٰذا اس کی ادائیگی کی سعی و جہد سے دلوں کو راحت اور قلوب کو اطمینان و سکون حاصل ہوگا ——— اور مشکل اس اعتبار سے کہ بسا اوقات اس راہ کی مسلسل جد و جہد کا کوئی محسوس نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آتا اور انسان کو کمال صبر و استقامت کے ساتھ اپنی محنت کے نتائج و ثمرات سے بالکل بے نیاز ہو کر کام کئے جانا پڑتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ "اے علی، اگر اللہ تیرے ذریعے کسی ایک انسان کو بھی ہدایت کی راہ پر لے آئے تو یہ تیرے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے"! بس

یہی اس راہ کے ہر مسافر کا ماٹو (MOTTO) ہونا چاہیئے اور اگر اس کے نتیجے اللہ تعالیٰ ایک فرد بشر کو بھی سیدھی راہ پر لے آئے تو اسے چاہیئے کہ اس بات کو واقعۃً ایک دولت بے بہا اور نعمت غیر مترقبہ تصور کرے، واقعہ یہ ہے کہ اگر ہمارے قلب و نظر کی کیفیت فی الواقع یہ نہ ہو جائے تو اس راہ میں ثابت قدم رہنا محال ہے۔

آخر میں میں اپنے اور آپ سب کے لئے اللہ تعالیٰ سے ہدایت و استقامت اور عفو و مغفرت کی دعا کرتا ہوں ——— واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

(میثاق لاہور، بابت دسمبر ۱۹۶۷ء)

مولانا امین احسن اصلاحی کا
الوداعی خطاب

عزیز ساتھیو!

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے آپ نے ایک جماعتی نظم کے قیام کی قرارداد پر اتفاق کر لیا ہے۔ اس پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کام کے لئے عزم و ہمت عطا فرمائے اور ہر قدم پر ہماری دستگیری اور رہنمائی فرمائے ——— میں اس موقع پر آپ کے سامنے یہ اعتراف کرتا ہوں کہ ہر چند اس کی ضرورت اور اہمیت مجھ پر واضح تھی۔ لیکن میں دو سبب سے اس قسم کی ذمہ داری سے گریز کرتا رہا۔ ایک تو یہ کہ اب میرے قویٰ ضعیف ہو رہے ہیں۔ کوئی بھاری بوجھ اٹھانا میرے لئے ممکن نہیں رہا۔ دوسرا یہ کہ زندگی کے اس آخری دور کے لئے اپنے ذوق کے مناسب جو کام میں نے تجویز کر لیا تھا اب وقت و فرصت کا لمحہ لمحہ اس پر صرف کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دوستوں کے شدید اصرار بلکہ دباؤ کے باوجود میں خود اس کے لئے پہل کرنے کی ہمت نہیں کر سکا۔ دوستوں نے جب کبھی اس فریضہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی میں ان کے دلائل کا تو انکار نہ کر سکا، لیکن اپنی کمزوریوں اور مجبوریوں پر نگاہ کر کے ان کی بات کو ٹالتا ہی رہا۔ میں یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اگرچہ میرے اوقات تمام تر دینی و علمی کاموں ہی میں بسر ہو رہے ہیں تاہم معاشرے سے متعلق مجھ پر جو بھی فریضہ عائد ہوتا ہے اس میں مجھ سے کوتاہی ہو رہی ہے جس کے سبب سے نہ صرف میری بعض صلاحیتیں سکڑ رہی ہیں بلکہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس پر مجھ سے مواخذہ ہو۔ ان تمام احساسات کے باوجود

میں اپنے آپ کو معذور سمجھتا رہا۔ جس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو معذور سمجھنے میں بڑا فیاض ہوتا ہے۔

بہر حال اب میں پورے شرح صدر کے ساتھ اس کام میں شریک ہوتا ہوں اور ان تمام دوستوں کا دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے اس عظیم فرض کی اہمیت کو سمجھا اور ہم سب کو اس کے سمجھانے کا اہتمام کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

میرے ذمہ اس وقت آپ تمام شرکائے مجلس کو بعض ضروری ہدایات دینے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔ یہ ہدایات ان کاموں سے متعلق ہیں جو آپ کو یہاں سے رخصت ہونے کے بعد کرنے ہیں۔ براہ کرم ان کو نوٹ کر لیجئے۔

جماعتی تنظیم سے متعلق اس وقت آپ کو پہلا کام یہ کرنا ہے کہ تنظیم کے نظام و دستور سے متعلق آپ کے سامنے جو تجویزیں ہیں وہ مقامی رفقاء سے مشورہ کے بعد قلم بند کر کے شیخ سلطان احمد صاحب کے پاس بھیج دیجئے تاکہ مجلس مشاورت ان سے فائدہ اٹھا سکے۔ حتی الوسع اس بات کی کوشش کیجئے کہ تجاویز کے بارے میں اگر اختلاف رائے ہو تو وہ غور و بحث سے مقامی رفقاء ہی کے اندر طے ہو جائے تاکہ آگے کا کام آسان ہو جائے۔ اگر غور و بحث کے بعد بھی کسی امر میں اختلاف باقی رہ جائے تو اس کو نوٹ کر دیا جائے۔

اپنی اور اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح و تربیت سے متعلق جو کام آپ کو کرنے ہیں ان کے بارے میں مفصل ہدایات تو افرادی قوت کا جائزہ لینے کے بعد ہی دی جا سکیں گی لیکن چند کام ایسے ابتدائی اور بدیہی نوعیت کے ہیں کہ ان کا اہتمام بلا تاخیر آپ کو کرنا چاہیئے۔

پہلا کام نماز کا اہتمام ہے۔ نماز ہمارے دین میں ایمان کا اوّلیں تقاضا ہے۔ قرآن و حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ اسلامی تنظیم کی شیرازہ بندی اسی چیز سے ہوتی ہے اور انبیاء علیہم السلام نے اصلاح و تربیت کا پہلا قدم اسی سے اٹھایا ہے۔ آپ بھی اس کی پابندی کے لئے مصمم عزم کیجئے اور اپنے عزیزوں، قریبوں، دوستوں، پڑوسیوں اور محلہ داروں کو بھی دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ اس کی تلقین کیجئے۔ نماز کے اہتمام میں یہ بات بھی داخل ہے کہ حتی الوسع محلہ کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کیجئے۔ بغیر کسی عذر معقول کے اس میں کوتاہی نہ کیجئے اور دوسروں کو بھی نماز باجماعت کی عظمت و اہمیت سمجھانے کی کوشش کیجئے۔

دوسرا کام یہ ہے کہ اپنے دینی علم میں اضافہ کا اہتمام کیجئے۔ جن مقامات پر یہ ممکن ہو کہ کسی ذی علم

کی رہنمائی میں قرآن مجید کا اجتماعی مطالعہ کیا جا سکے وہاں حلقہ تدبر قرآن قائم کیجئے اور ہفتہ میں کم از کم ایک دن اس کام کے لئے خاص کیجئے کہ کچھ وقت قرآن کے فکر و مطالعہ میں بسر ہو۔ اس کے ساتھ اگر حدیث کی ایسی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا جائے جو اخلاقی احادیث پر مشتمل ہیں مثلاً ریاض الصالحین وغیرہ تو اس سے مزید خیر و برکت ہوگی۔ اگر کسی ذی علم کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو عام حلقہ مطالعہ اسلامی قائم کیجئے اور منتخب اسلامی کتب کا التزام سے مطالعہ کیجئے۔ اس قسم کے حلقوں میں اپنے ان دینی بھائیوں کو بھی شرکت کی دعوت دیجئے جن کے اندر دین اور علم دین کی رغبت محسوس کریں۔

آپ لوگوں میں سے جن لوگوں نے جدید تعلیم پائی ہے ان کو میں یہ مشورہ بھی دوں گا کہ وہ عربی زبان سیکھنے کی کوشش کریں تاکہ وہ قرآن و حدیث سے براہ راست استفادہ کر سکیں۔ بظاہر یہ کام مشکل نظر آتا ہے لیکن شوق اور طلب سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ اپنے اپنے شہروں میں جس عالم سے بھی اس کام میں آپ کو مدد ملنے کی توقع ہو اس سے استفادہ کیجئے۔ ہم خود بھی حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس مسئلہ پر غور کریں گے کہ آسان طریقہ سے آپ کو عربی سکھانے کی کیا شکل اختیار کی جا سکتی ہے۔ لاہور میں اس سلسلہ میں ہم نے جو تجربے کئے ہیں ہم ان سے بھی آپ کو آگاہ کریں گے تاکہ جن مقامات پر اس نہج پر درس جاری ہو سکے وہاں اس نہج پر درس جاری کئے جائیں۔

تیسرا کام یہ ہے کہ اپنے اپنے مقامات پر اپنے ہم خیال اور رفیق تلاش کیجئے جن کے تعاون سے پیش نظر مقصد کو تقویت حاصل ہو۔ جو اس جد و جہد میں آپ کے لئے سہارا بن سکیں اور جن کے لئے آپ سہارا بن سکیں جو آپ کی اصلاح کریں اور جن کی آپ اصلاح کریں۔ جماعتی زندگی کی بھی خیر و برکت ہے جو انفرادی زندگی میں حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ یہ زمانہ بہت برا ہے لیکن اس برے زمانے میں بھی اچھی روحیں اور نیک نفوس موجود ہیں۔ ضرورت ٹٹولنے اور جستجو کی ہے۔ جب آپ جستجو کریں گے تو اللہ کے بے شمار بندے ایسے مل جائیں گے جو آپ کی رفاقت کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے کتنے نفوس ہوتے ہیں جن کے اندر دینی حس موجود ہوتی ہے لیکن کوئی اس کے اکسانے والا نہیں ہوتا اس وجہ سے وہ دبی ہوئی رہتی ہے۔ آپ ایسے نفوس تلاش کیجئے، ان تک پہنچئے، ان سے تبادلہ خیالات کیجئے اور اس کام میں ان کو تعاون کی دعوت دیجئے۔

آپ کی اجتماعی طاقت جتنی ہی بڑھتی جائے گی اتنی ہی ان کاموں کی انجام دہی آپ کے لئے آسان ہوتی جائے گی۔ جو افراد اور معاشرہ کی اصلاح سے متعلق آپ پیش نظر رکھتے ہیں۔

یہ چند ابتدائی کام ہیں جو اس قرارداد کی روشنی میں جو آپ نے پاس کی ہے فی الفور شروع کئے

(باقی صفحہ ۹۵ پر)

تائید و تبصرہ

۱: مولانا عبدالماجد دریابادی مدیر "صدق جدید" لکھنؤ

ایک نیا اصلاحی ادارہ

"لاہور کے ایک معزز دینی ماہنامہ "میثاق" سے یہ معلوم کرکے دلی خوشی ہوئی کہ وہاں چند ذی فہم و بصیرت مخلصوں کی سعی و اہتمام سے ایک نئے دینی ادارہ کی بنیاد بالکل صحیح اصول پر پڑ رہی ہے۔ یہ حضرات زیادہ تر جماعت اسلامی سے نکلے ہوئے ارکان ہیں اور یقین ہے کہ یہ انشاءاللہ ان غلطیوں سے محفوظ رہیں گے جن کا خوب تجربہ انہیں جماعت مذکور میں شامل رہ کر ہو چکا ہے۔ ادارہ کے ایک بانی مولانا امین احسن اصلاحی کی یہ بات آب زر سے لکھنے کے قابل ہے :-

"جماعتیں اور تنظیمیں قائم تو ہوتی ہیں۔ اصلاً کسی اعلیٰ و برتر نصب العین کے لئے، لیکن قائم ہو جانے کے بعد وہ رفتہ رفتہ از خود نصب العین اور مقصد بن جاتی ہیں اور اصل نصب العین غائب ہو جاتا ہے"

یہ صدق کے مسلک کی صدفی صد ترجمانی ہے۔ مولانا اصلاحی کی تقریر کا یہ ٹکڑا بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے :-

"ارباب اقتدار کی ہر بات کو ہدف تنقید بنا لینا یہاں تک کہ ان کے خیر کو بھی شر قرار دے لینا اور اس کی مخالفت میں اس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی برائیاں بھی ان کے کھاتے میں ڈال دینا نہ عقل و منطق کی رو سے جائز ہے اور نہ اسلام کی رو سے یہ اقتدار کی ہوس میں اندھے ہو جانے کی علامت ہے"

اور پاکستان کی (ہندوستان کی نہیں) جماعت اسلامی کو شدید ترین نقصان شاید اسی چیز نے پہنچایا ہے اللہ ہم کو پچھلی غلطیوں سے سبق لینے کی توفیق دے اور راہ اصلاح و ہدایت پر مستقیم رکھے"

خدمتِ دین کی گنجائشیں

"پاکستان سے دینی ماہنامہ "میثاق" لاہور سے، نئی دینی و اجتماعی تنظیم کے سلسلے میں :

"آخر میں اس امر کی وضاحت بہت ضروری ہے کہ پیش نظر تنظیم ہرگز "الجماعت" کے حکم میں داخل نہ ہوگی۔ "الجماعت" کا مقام ہماری دانست میں امت مسلمہ کو بحیثیت مجموعی حاصل ہے۔ دین کی خدمت ایک نہایت وسیع و عریض کام ہے اور اس کے گوشے بے شمار ہیں۔ ہم ان تمام جماعتوں

اور اداروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو کسی بھی گوشے میں دین کی خدمت کا کام کر رہی ہیں اور انشاء اللہ ان کے ساتھ ہمارا رویہ تعاون و تائید ہی کا ہوگا۔"

بات اصلاً بہت موٹی اور بالکل صاف و واضح ہے لیکن اس زمانے میں بہت بڑی بات ہے۔ دین و امت کی خدمت کے اتنے پہلو ہیں اور خدمت کے لئے گنجائش اتنی ہے کہ اگر نفسانیت کو چھوڑ کر تھوڑے سے بھی عزم و حوصلہ کے ساتھ خدمت کا ارادہ ہو تو خلوص اور فہم سلیم سے کام لینے والا ہر فردِ امت اس کے اندر کھپ سکتا ہے اور باہمی مناقشہ سے جو اب تک بڑا سنگ راہ بنا ہوا ہے نجات پاکر ہر گروہ اپنے مذاق و استعداد کے لحاظ سے سچا خادم دین بن سکتا ہے۔"

("میثاق" لاہور جنوری ۱۹۶۸ء بحوالہ صدق جدید ۱۷ نومبر ۱۹۶۷ء)

۲: مولانا عبدالباری ندوی

فرنگی ساخت کی جماعت سازی اور اس کی فتنہ سامانی

"تازہ 'میثاق' میں زیادہ تر پرانی جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے والے حضرات جو ایک نئی جماعت بنا رہے ہیں اور جس کا ہمارے حضرت صاحب صدق نے بھی خیر مقدم کیا ہے اس کی تفصیلات معلوم ہوئیں۔ آپ کی تقریر کی جس بات کی صاحب صدق نے داد دی ہے میں بھی اسے ہی سب سے زیادہ قابل داد اور آب زر کیا آب جواہر سے لکھنے کے قابل پاتا ہوں۔ میں تو فرنگی ساخت کی جماعت سازیوں کے عین خمیر ہی میں اس فساد کو داخل جانتا ہوں اور علی الاعلان کہا کرتا ہوں کہ یہ افتراق سازی کی بنیاد ہوتی ہے۔ انبیاء کا طریق یہ ہے کہ صاحب دعوت دعوت اپنی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے اور بلا کسی مصنوعی جماعت سازی کے جو لوگ برضا و رغبت اس کے ساتھ شریک ہوتے ہیں بس وہی "حزب اللہ" بن جاتے ہیں اور قواعد و ضوابط اور کثرت رائے وغیرہ کی بحث کے بغیر جب تک وہ داعی کے ساتھ چلتے رہتے ہیں تبھی تک خیریت رہتی ہے۔ باقی جہاں اقلیت و اکثریت وغیرہ کی رائے شماری اور صدر و سیکرٹری اور چندہ بازی وغیرہ کے جدید فرنگی طریقے داخل ہوتے بس پھوٹ یقینی ہے کہ ایسی صورت میں جیسا آپ نے بالکل صحیح لکھا ہے (بالکل نفسیاتی طور پر) جماعت خود مقصود بن جاتی ہے اور اصل مقصود غائب ہوتے ہوتے بمنزلہ صفر ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جب تک غیر معمولی اخلاص و للّٰہیت کم و بیش تمام افراد جماعت میں نہ ہوں، جماعتی

عصبیت و رقابت اس جماعت سازی کا لازمہ ہے۔ مجھے تو ہمیشہ الہ آباد کے عارف اکبر کا یہ عارفانہ شعر برابر یاد آتا رہتا ہے جس کے ذریعے اس طرز کی جماعت سازیوں کے آغاز ہی میں انہوں نے آگاہ فرما دیا تھا:

کریما ببخشائے بر حال بندہ   کہ ہستم اسیرِ کمیٹی و چندہ!

اور یہ سراپا ناکارہ ..... اور .... کے حضرات سے یہی عرض کرتا رہتا ہے کہ اپنی جماعتوں کو توڑ دیں کہ ان میں سے انجام کسی ایک کا بھی بخیر نہیں ہوا ..... میں جب آخر تک کوئی صدارت سے کنارہ کش ہونے پر راضی نہ ہوا تو بالآخر صدارت کو دو صدروں میں تقسیم کرنا پڑا!"

(مولانا اصلاحی کے نام ایک خط سے ماخوذ)

بقیہ: سر افگندیم : صفحہ ۶۰ سے آگے

کے ساتھ کہ مجھے اس کا کوئی جذباتی جواب مطلوب نہیں۔ اگر صرف جذبات میں ہاں کرا لینے کی خواہش ہوتی تو شاید میں ابھی آپ سب کے ہاتھ کھڑے کرا لیتا۔ لیکن مطلوب اصل میں یہ ہے جو آئے خوب سوچ سمجھ کر آئے۔ دل و دماغ کے متفقہ فیصلے کے بعد آئے اور پھر آئے تو تحفظات کے ساتھ نہ آئے بلکہ تن، من، دھن سب کے ساتھ آئے اور یہ اچھی طرح جان کر آئے کہ ؎

در رہ منزلِ لیلےٰ کہ خطرہاست بسے
شرطِ اوّل قدم این است کہ مجنوں باشی!

اَقُولُ قَولِی هٰذا و اَستَغفِرُ اللّٰهَ لِی وَ لَکُم وَ لِسَائِرِ المُسلِمِینَ وَالمُسلِمَاتِ وَ اٰخِرُ دَعوَانَا اَنِ الحَمدُ لِلّٰهِ رَبِّ العٰلَمِینَ ۔

بقیہ: مولانا امین احسن اصلاحی کا الوداعی خطاب: صفحہ ۹۲ سے آگے

جا سکتے ہیں آگے اللہ تعالیٰ مزید کاموں کی راہیں کھولے گا۔ اگر ہمارے اندر اس کے دین کی خدمت کے لئے اخلاص ہوگا ــــــ اب دعا کیجیے کہ ہمیں اس کام کے لئے سچا عزم حاصل ہو اور ہر قدم پہ توفیق الٰہی ہماری رہنمائی فرماتے۔

اسرار احمد

دعوت الی اللہ
کی اہمیت
اور اس کے اصول و مبادی

ایک تقریر جو یکم اکتوبر ۱۹۷۴ء کی رات کو جامعہ محمدیہ ملتان کے سالانہ اجلاس میں کی گئی،

حمد و ثنا کے بعد آیہ کریمہ "وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" کی تلاوت کی گئی اور عرض کیا گیا :-

بزرگو اور بھائیو!

حقیقت یہ ہے کہ میرا یہ مقام ہرگز نہ تھا کہ میں ایسے عظیم الشان دینی اجتماع سے خطاب کرتا۔ تاہم جب آپ حضرات کا حکم ہے تو میں کچھ معروضات پیش خدمت کرتا ہوں، اور اب جبکہ آپ حضرات سے ہم کلام ہونے کا ایک موقع مل ہی گیا ہے تو کوشش کرتا ہوں کہ ایسی بات آپ کے گوش گذار کروں جو حقیقتاً مفید ہو اور جس سے کم از کم ان لوگوں کو ضرور فائدہ پہنچے جو اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ کی کیفیت کے ساتھ ان گذارشات کو سنیں اس لیے کہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں امید کی جا سکتی ہے کہ ؎

شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات!

میں نے اپنی گذارشات کا عنوان قرآن حکیم کی اس آیت کو بنایا ہے کہ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ یعنی اس شخص سے بہتر بات اور کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور یہ کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں! یعنی میری آج کی گذارشات کا موضوع ہے۔ دعوت الی اللہ۔ اس موضوع کا انتخاب میں نے دو وجوہات کی بنا پر کیا ہے :-

امت کا فرض منصبی ایک یہ کہ میں اور آپ جس امت کے افراد ہیں۔ اس کا مقصد وجود اور غرض تاسیس ہی دعوت الی اللہ ہے اور دنیا میں ہمارا عزت اور سربلندی ہی نہیں ہمارے وجود اور بقا کا انحصار بھی اسی بات پر ہے کہ ہم اپنے اس فرض منصبی کو کما حقہٗ ادا کریں۔ سورۃ بقرہ کے سترھویں رکوع میں تحویل قبلہ کے حکم کے ساتھ ہی یہ آیت وارد ہوئی ہے کہ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا

شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ہم نے تمہیں ایک اُمّتِ وسط اس لیے بنایا ہے کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور یہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلّم) تم پر گواہ ہوں۔ تحویل قبلہ کا حکم دراصل علامت (SYMBOL) تھی اس امر کی کہ اب متولیان مسجد اقصیٰ یعنی بنو اسرائیل سے ہدایت خداوندی کی امانت داری و علمبرداری کا منصب سلب کر لیا گیا اور متولیان مسجد حرام یعنی بنو اسمٰعیل اس منصب پر فائز کر دیئے گئے۔ ظاہر ہے کہ امّتِ مسلمہ کا اصل مرکز اور قلب (NUCLEUS) ہونے کی حیثیت بنو اسمٰعیل ہی کو حاصل ہے، ان ہی کی زبان خدا کی آخری کتاب کی حامل بنی اور ان ہی کے رسوم و رواج سے قطع و برید اور حذف و اضافے کے ساتھ خدا کی آخری شریعت کا تانا بانا تیار ہوا "اٰخَرِيْنَ" یعنی وہ دوسری اقوام جو بعد میں اس امّت میں شامل ہوتی چلی گئیں معنوی اعتبار سے یقیناً "مِنْهُمْ" یعنی ان ہی میں سے ہیں۔ اور یہ بھی اللہ کا بڑا ہی فضل ہے جو ان پر ہوا۔ لیکن یہ شرف "اُمِّيِّيْنَ" ہی کو حاصل ہوا کہ خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت اُن ہی میں — اور — ان ہی میں سے، ہوئی[1]

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!

ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں!

اس امت کی وجہ تشکیل اور غرض تاسیس سورہ آل عمران میں ان الفاظ میں بیان ہوئی کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ تم وہ بہترین امت ہو جسے نوع انسانی کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم حکم دیتے ہو نیکی کا، روکتے ہو بدی سے اور ایمان رکھتے ہو خدا پر۔ گویا دنیا کی دوسری تمام اقوام و امم اپنے لیے جیتی ہیں اور ان کا مطمح نظر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ ان کا بول بالا اور عظمت دوبالا ہو اور وہ آدم کی زیادہ سے زیادہ اولاد کو بس پڑے تو عسکری و سیاسی ورنہ کم از کم معاشی و تہذیبی تسلّط کے چنگل میں گرفتار کر کے اپنے تابع رکھ سکیں لیکن اس امّت کا جینا اس لیے ہے کہ دنیا میں اللہ کا نام رہے[2] اس کا کلمہ بلند ہو، حق کا بول بالا ہو۔ نیکیاں عام ہوں اور اچھائیاں پروان چڑھیں۔ اور بدیاں ختم ہوں اور برائیوں کا استیصال ہو جائے۔ یعنی یہ امّت دراصل دنیا میں خدا کی نمائندہ، خیر کا ذریعہ و آلہ (INSTRUMENT) اور شر اور باطل کے استیصال کا ادارہ (INSTITUTION) ہے۔

جب تک یہ اپنے اس فرض منصبی کو ادا کرتی رہی۔ اس کا اپنا بول بھی بالا اور حق کے ساتھ یہ بھی سربلند رہی۔ لیکن جب اس نے اپنے مقصد وجود کو بھلا دیا اور یہ بھی بس دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ایک قوم بن کر رہ گئی تو اس

[1] اشارہ ہے سورۂ جمعہ کی آیات ۲ تا ۴ کی جانب!

[2] ع ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے۔ اقبال

پر بھی اسی طرح عتاب خداوندی نازل ہوا جس طرح اس سے پہلے بنی اسرائیل پر ہوا تھا۔ اول اول معاملہ صرف وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ [1] تک محدود رہا اور عالم اسلام کی سیادت بنی اسمٰعیل یعنی عربوں سے چھین کر کردوں اور سلجوقیوں کو عطا کر دی گئی۔ اس پر بھی آنکھیں نہ کھلیں تو فتنۂ تاتار کی صورت میں قہر خداوندی کا "وعدۂ اولیٰ" نازل ہوا اور بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ فَجَاسُوا خِلَالَ الدِّيَارِ ۚ کا ہو بہو نقشہ کھنچ گیا۔ تاریخ حیران کہ اہل ہند فتنۂ تاتار کا انتظار ہی کیوں کرتے رہ گئے اور کیوں ان کا رُخ تیر کی مانند سیدھا بغداد کی طرف رہا۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس اُمت کا مرکز بنو اسمٰعیل تھے اور اس کا قلب بغداد تھا اور اصل گوشمالی ان ہی مطلوب تھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے بعد مسلمانوں میں سے جو قوتیں ابھریں۔ وہ بنی اسمٰعیل میں سے نہ تھیں۔ "آخرین" میں سے تھیں یعنی ہند میں مغل اور ایشیائے کوچک میں ترک جو بالآخر خلافتِ اسلامی کے بھی وارث ہوئے اور اس طرح بنو اسمٰعیل کی مذہبی و دینی سیادت کا آخری امتیازی نشان بھی مٹ گیا اور ان کی حیثیت ترکوں کے محکوموں اور باج گزاروں سے زیادہ کچھ نہ رہی۔ یہ تو اس صدی کے واقعات ہیں کہ اس کے اوائل میں وہ ترکوں کی غلامی سے نکل کر پہلے یورپی تسلّط کے تحت آئے اور پھر صدی کے وسط کے لگ بھگ آہستہ آہستہ اس سے بھی نجات پائی اور آزادی کا سانس لیا۔ اس کے بعد کی ربع صدی اس داستان کا المناک ترین باب ہے کہ آزاد ہو کر بھی جب انہوں نے دین سے بے رخی اختیار کی اور تعیّش و تنعّم کی زندگی کو اختیار کیا اور مغربی تہذیب کے ظاہر سے متاثر ہو کر عیّاشی اور فکری و عملی آوارگی کو شعار بنایا۔ ملّت اسلامی کی بجائے نسلی و وطنی عصبیتوں کو ابھارا۔ شریعت کو پس پشت ڈالا اور مذہب کے نام لیواؤں پر مظالم ڈھائے تو بالآخر کم از کم بنی اسمٰعیل کی حد تک تو وَعْدُ الْآخِرَةِ "بھی آ کر رہا اور اللہ نے اپنی ایک علی الاعلان (PROCLAIMED) مغضوب قوم کے ہاتھوں انہیں ایسی ذلت آمیز شکست دی کہ رہے نام اللہ کا۔ [2]

---

[1] سورہ فتح۔ اگر تم پھر جاؤ گے تو وہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو اسی مقام پر فائز کر دے گا۔

[2] راقم الحروف نے جولائی ۱۹۶۷ء کے میثاق میں سیاہ حاشیے میں لکھا تھا۔ "گذشتہ ماہ اسرائیل کے ہاتھوں مسلمانانِ عرب کو جو ذلت آمیز شکست اٹھانی پڑی اور جس پر پوری دنیا کے مسلمانوں نے اپنے دلوں میں درد کی شدید ٹیسیں محسوس کیں۔ پھر نام نہاد اقوام متحدہ نے اس معاملے میں سرد مہری ہی نہیں باقاعدہ اسرائیل نوازی کا جو رویہ اختیار کیا اس سے کم از کم مسلمانانِ عرب کے لیے تو ایک بار "ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ" کی وہی کیفیت پیدا ہو گئی جس میں کئی ہزار سال تک بنی اسرائیل مبتلا رہے ہیں۔" اس وقت یہ اندازہ ہو سکتا تھا کہ صرف چار ساڑھے چار سال بعد ہی سقوطِ مشرقی پاکستان کی صورت میں عذاب خداوندی کا ایک کوڑا "آخرین" کے ایک اہم حصّے کی پیٹھ پر پڑنے والا ہے!

حالیہ عرب اسرائیل جنگ سے ذلیل و خوار تو پوری ملّت اسلامی ہوئی اور یہ داغ رسوائی لازماً سارے ہی مسلمانوں کے حصّے میں آیا۔ لیکن اس میں " اَلَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ " کا مصداق بہرحال عرب ہی ہیں۔ دینی پستی اور مذہب سے بُعد یقیناً اس وقت پوری اُمّت مسلمہ ہی کا حال ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے میں مصر، شام اور لبنان کی بدمستیاں دوسرے مسلمانوں سے کئی ہاتھ آگے ہیں۔ تو پھر کون سے تعجب کی بات ہے۔ اگر ذلّت و رسوائی میں سے بھی سب سے بڑا حصّہ انہی نے پایا۔ ویسے بھی جب عزّت فضیلت اور شرف میں یہ مقدّم تھے تو منطقی طور پر ذلّت و رسوائی کا بھی حصّہ اولیٰ انہی کا ہونا چاہیئے!

قصّہ طول کھینچ گیا۔ عرض صرف اس قدر کرنا تھا کہ اس امّت کی غرض تاسیس دعوت الی اللہ ہے اور اس پر نہ صرف یہ کہ اس کی عزّت و عظمت کا انحصار بلکہ وجود و بقا کا دار و مدار بھی ہے اور " اُمّیّین " اور " آخَرِیْنَ " دونوں کے لیے ایک ہی راہ ہے کہ " عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ " کی نوید جانفزا سے گرتے ہوئے حوصلوں کو از سرِ نو استوار اور ٹوٹتی ہوئی امیدوں کو نئے سرے سے قائم کریں اور " وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا "[1] کی وعید سے لرزاں و ترساں ہو کر اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ پے در پے تنبیہات اسی لیے ہیں کہ ہم جان لیں کہ ہمارے لیے " فَفِرُّوْا اِلَی اللّٰہِ " کے سوا کوئی راہ نہیں ہے اور اپنی عظمت و سطوت پارینہ کی بازیافت ہی نہیں بلکہ اپنے وجود و بقا کی ضمانت کے لیے بھی کوئی لائحہ عمل " دعوت الی اللہ " کے سوا موجود نہیں ہے۔!

رسولؐ اللہ کی مؤکّد ترین سنّت

دوسرا[2] سبب آج کے اس اجتماع میں اس موضوع پر گفتگو کا یہ ہے کہ یہ ایسے لوگوں کا اجتماع ہے جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے شیدائی ہیں اور جن کا مسلک و مشرب ہی یہ ہے کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت کے اتباع کا جذبہ موجود ہے۔ لیکن افسوس کہ آپ کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی بہت سی دوسری سنّتیں تو یاد ہیں اور ان پر آپ عمل بھی پوری شدّت کے ساتھ کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی وجہ سے آپ دوسروں سے جنگ و جدل سے بھی نہیں چوکتے۔ لیکن حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سب سے بڑی سنّت، جس سے زیادہ موکّد سنت اور کوئی نہیں جس پہ آپ کا تواترِ عمل ظاہر و باہر ہے، جس پر آپؐ اپنی بعثت کی پہلی ساعت سے حیات دنیوی کی آخری گھڑی تک ہر لحظہ و ہر آن عمل پیرا رہے۔ اسے آپ نے نہ صرف یہ کہ عملاً ترک کر دیا ہے، بلکہ بُھلا بھی دیا ہے۔ میری مراد " سنّتِ دعوت " سے ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی مؤکّد ترین سنّت

---

[1] دیکھیے سورہ بنی اسرائیل کی آیات ۴ تا ۸

نہیں ہے ؟ کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی بھر حضورؐ کو دعوت و تبلیغ سے زیادہ کسی بات کا دھیان یا دھن رہی ؟ اب اگر سنّت نام ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے طریقے اور طرزِ عمل کا تو خدارا سوچیے کہ آنحضورؐ کی سب سے بڑی سنّت کون سی ہے " بَلِّغُوْا عَنِّیْ " کے تاکیدی حکم پر غور کیجیے کہ اس کو " وَلَوْ اٰیَةً "[1] کے ذریعے کس قدر عمومیّت دے دی گئی ہے ۔ رفع یدین جس کے بارے میں آپ بہت جھگڑتے ہیں ۔ کون ہے جو یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ اس پر آپؐ عمر بھر عمل پیرا رہے ! آمین بالجہر کے بارے میں کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ اس پر آپؐ نے از اوّل تا آخر مداومت کی ؟ برعکس اس کے " دعوت و تبلیغ " وہ سنّت موکّدہ ہے جس پر آپؐ ۲۳ سال کی پوری مدّت کے دوران مسلسل عمل پیرا رہے ۔ گویا دعوتِ الی اللہ ایک[1] طرف تو از روئے قرآن امّتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود اور فرضِ منصبی ہے اور دوسری[2] طرف ہمارے محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلّم کی مؤکّد ترین سنّت ہے ۔ لہٰذا اسی موضوع پر میں آپ سے چند باتیں کروں گا ۔ !

دعوت الی اللہ کے مراحل و مدارج

' دعوتِ دین ' یا دعوتِ الی اللہ ' کوئی مفرد یا بسیط عمل نہیں ہے ۔ بلکہ اس کے متعدد پہلو اور بے شمار مراتب و مدارج ہیں ۔ یہ ایک فرد کی اپنی ذات اور اس کے اہل و عیال (قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا ۝) سے شروع ہو کر ، اس کے کنبے قبیلے (وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ۝) پھر قوم (یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰہَ) اور بالآخر پوری نوعِ انسانی (لِتَکُوْنُوْا شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ) تک پہنچتی ہے ۔ اس کی ابتداء محض خبردار کرنے اور " ڈر سنا دینے " (یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝) سے ہوتی ہے لیکن اس کا منتہائے مقصود یہ ہوتا ہے کہ خالقِ کائنات کی کبریائی کا اعلان و اظہار ہو ۔ (وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ ۝) حسبِ استعداد و مذاقِ مخاطبین اسے بلند پایہ علمی و عقلی استدلال کے ساتھ بھی پیش کیا جانا چاہیے (اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ) اور مؤثر و دلنشیں وعظ و نصیحت (وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ) کے ذریعے بھی ۔ پھر کٹ حجتوں اور ہٹ دھرم لوگوں کے مقابلے میں بحث و جدال کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے (وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ) اور وقت آنے پر جہاد و قتال بھی اسی دعوتِ الٰہی کی بلند ترین منازل قرار پاتے ہیں ۔ (وَ قَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ یَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰہِ ۝) تاکہ اللہ کا کلمہ سربلند ہو ۔ اسی کا حکم چلے اور لوگ عدل و قسط پر قائم ہوں ۔ (لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۝)

---

[1] حدیث نبویؐ ۔ میری جانب سے پہنچاؤ ۔ چاہے ایک ہی آیت !

آج کی اس گفتگو میں میں دعوت اللہ کے ان بلند تر مراتب سے بحث نہیں کرنا چاہتا جن کے لیے اجتماعی جدوجہد لازمی ہے یعنی ایک تو تمام بنی آدم پر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی جانب سے اتمام حجت کا وہ فریضہ میری آج کی گفتگو کے دائرے سے خارج ہے جو آپؐ کی امت پر بحیثیت مجموعی عائد ہوتا ہے۔ اور دوسرے خود اس امت کی اجتماعی اصلاح کا وہ کام بھی میری آج کی گفتگو کا براہ راست موضوع نہیں ہے جو بجائے خود ایک منظم اجتماعی جدوجہد کا متقاضی ہے۔ اس کے برعکس آج میں "دعوت الی اللہ" کی ان ابتدائی اور بنیادی منزلوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جن تک ہر مسلمان کی رسائی ممکن بھی ہے اور لازم بھی!

سنتِ رسولؐ کا تمسخر

اس سے پہلے میں اس استہزا کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو ہمارے معاشرے میں تبلیغ کے مقدس اور عظیم الشان فریضے کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں ہر مذہبی فرقے نے "مبلغین" کی ایک "سول سروس" جاری کی ہوئی ہے اور اس کے تحت تنخواہ دار مبلغ بعض اختلافی مسائل پر مناظرانہ انداز کی تقریریں دیہات و قصبات میں کرتے پھرتے ہیں جس سے اس کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا کہ ان کے ہم مسلک و ہم مشرب لوگوں پر وقتی طور پر ایک سرور کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ واقعتہً "ہم ہی حق پر ہیں اور ہمارا ہی مسلک صحیح تر ہے!" — ایسے مبلغین کی اکثریت کو تو اس کے سرے سے جرأت ہی نہیں ہوتی کہ اپنے سامعین کو براہ راست خطاب کر کے یہ کہہ سکیں کہ تمہارے اندر یہ خرابیاں ہیں انہیں دور کرو، سودی کاروبار نہ کرو، غلط حسابات نہ رکھو، رشوت نہ لو، اسراف نہ کرو[1] بعض واعظین اگر برائے بیت ایسی کوئی بات کہہ بھی دیں تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اس لیے جس اجتماع میں وہ تقریر کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کا اہتمام ان تمام غلط کاموں کی آمدنی سے ہوتا ہے! سامعین کی اکثریت تھوڑی دیر کے اپنے مقررین کی اس حق گوئی سے بھی لذت اندوز ہو لیتی ہے، رہے میاں حضرات اور چوہدری صاحبان تو وہ زیر لب مسکرا کر اس وقت تو ایک خاموش مگر تلخ طنز پر اکتفا کر لیتے ہیں مگر بعد میں اپنی نجی گفتگوؤں میں اپنے مذہبی پیشواؤں کی گھریلو و نجی خامیوں اور کوتاہیوں کا اہانت آمیز تذکرہ کر کے بدلہ چکا لیتے ہیں اور اس پورے سلسلے کا نام ہے تبلیغ دین!

حضرات! میں پورے سوز اور درد کے ساتھ یہ سوچنے کی دعوت دیتا ہوں کہ کیا یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ متواتر اور مؤکد سنت کے ساتھ استہزاء اور تمسخر نہیں ہے؟ اور کیا اس طرح تادانستہ طور

---

[1] واضح رہے کہ از روئے قرآن علماء و صلحاء امت مسلمہ کا فرض منصبی وہ ہے جس کی جانب اس آیت کریمہ میں اشارہ ہوا کہ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبَّانِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۝ (کیوں نہیں روکتے انہیں ان کے درویش اور علماء گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے؟)

پر ہم خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تحقیر کے مرتکب نہیں ہو رہے؟ 'منبر رسول' پر کھڑے ہونے والوں کی ہمارے اس معاشرے میں جو قدر و منزلت و عزت و وقعت ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا اصل سبب خود وہ ہیں یا دوسرے، اس سے کیا بالواسطہ خود اس محترم ہستی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحقیر نہیں ہوتی جس سے یہ منبر منسوب ہے؟ خدا کے لیے اپنے طرز عمل پر نظر ثانی فرمائیں۔ تنخواہ پر کام کرنا حرام نہیں ——

—— لیکن یہ واضح رہنا چاہیئے کہ معاوضے پر کام کرنے والا مدرّس و معلّم ہو سکتا ہے داعی و مبلّغ ہرگز نہیں ہو سکتا اس راہ کی تو سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہر طرح کے مفادات و اغراض سے بالکل پاک ہو کر خالص نصح و خیر خواہی کے جذبے سے اور اس اعلان کے ساتھ کام کیا جائے کہ وَمَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ [1]

احیائے سنّت کا اجر و ثواب

آپ حضرات نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث بہت مرتبہ سنی ہوگی کہ جس نے میری کسی ایسی ایک سنّت کو زندہ کیا جس پر عمل متروک ہو چکا ہو تو اس کو سو شہیدوں کا اجر و ثواب ملے گا، میں آج آپ کو اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی 'سنّتِ دعوت' کو زندہ کریں اور اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ آپ میں سے ہر شخص یہ فیصلہ کرے کہ آج سے میں "دین کا داعی" اللہ کی طرف پکارنے والا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ دعوت کا ادنیٰ متبع ہوں۔!

دعوت الی اللہ کی اصل شرط: اللہ کی ربوبیت پر اعتماد

اس بات کو بالکل دل سے نکال دیں کہ دین کی دعوت کے لیے دین کے کسی بڑے چوڑے علم کی ضرورت ہے، آج "علمِ دین" جن 'معلومات' کا نام ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ اکثر صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو آپ میں سے اکثر سے کم حاصل تھیں۔ انہیں جو علم بہ تمام و کمال حاصل تھا وہ "علم الایمان" تھا جیسا کہ ایک صحابی رضؓ فرماتے ہیں کہ تَعَلَّمْنَا الْاِيْمَانَ ثُمَّ تَعَلَّمْنَا الْقُرْاٰنَ "ہم نے ایمان پہلے سیکھا، قرآن بعد میں!"

منطقی طور پر بھی "دعوتِ الی اللہ" کا اصل لازمہ "ایمان باللہ" کو ہی ہونا چاہیئے، چنانچہ جو آیت میں نے سنائی تھی اس سے متصلاً قبل ایمان باللہ کی بلند ترین منزل یعنی ربوبیت خداوندی پر دل کے جم اور ٹھک جانے اور اس پر استقامت حاصل ہوتے ہی کا تذکرہ ہے کہ " اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ

---

[1] ترجمہ: میں تم سے اس (دعوت) پر کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میرا اجر تو بس اللہ کے ذمے ہے!

مُسْتَقَامُوْا ...... الخ " دعوت الی اللہ کے منصب پر فائز وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو خدا کی ربوبیت پر پوری طرح مطمئن اور اس پر مضبوطی سے قائم ہوں۔

دوسری شرط: عمل صالح

'دعوت الی اللہ' کا دوسرا لازمہ یہ ہے کہ داعی کی عملی زندگی میں ایمان باللہ کے اثرات محسوس و مشہود ہوں اور وہ عمل صالح کا ایک حسین نمونہ ہو چنانچہ اس آیت میں بھی وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلاً مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ کے فوراً بعد وعمل صالحاً کا تذکرہ ہے، اس لیے کہ یہ دعوت کے موثر ہونے کی شرط لازم ہے! اس کے بغیر، تعلیم و تدریس ہوسکتی ہے۔ اعلیٰ سطح کا علمی کام بھی کیا جاسکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان چیزوں کا اپنا ایک مقام اور ان کی اپنی ایک افادیت ہے۔ لیکن 'دعوت' مؤثر صرف وہی ہوسکتی ہے جس کا شاہد 'عمل صالح' ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ 'عمل صالح' ہی وہ مشکل "گھاٹی" ہے[1] جس سے جی چرا کر ہم لوگوں نے یہ 'تقسیم کار' کی ہے کہ کچھ لوگ اس کی قید سے آزاد ہوں اور حلال و حرام سب ذرائع سے دولت کما کر کچھ دوسرے لوگوں کو پالیں، جو دین کی تبلیغ کا کام کریں۔ ذہانت کا تو یہ یقیناً ایک شاہکار ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ دین کے خلاف اس 'شریفانہ معاہدے' سے بڑی سازش شاید کوئی اور نہ ہو!

دعوت الی اللہ کا اصل ہدف

یہ آیۂ کریمہ دعوت کے مطلوبہ عمل کے ایک اور پہلو کو بھی واضح کر رہی ہے اور وہ یہ کہ دعوت اللہ اور اس کے دین کی طرف ہونی چاہیے نہ کہ کسی خاص فرد، یا گروہ، یا جماعت یا فرقے یا مسلک و مشرب کی طرف 'دعوت' کا اصل ہدف یہ ہونا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اللہ کو پہچانیں، اس کی ربوبیت کا اقرار کریں اور اس پر پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ یقین رکھیں، اسی کی اطاعت و بندگی کو اپنے اوپر لازم کریں اور اسی کی رضا جوئی کو اپنی زندگیوں کا نصب العین بنائیں اور اس کے لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کو اختیار کریں۔ اس بات کو اس آیۂ کریمہ میں دو طرح واضح فرمایا گیا، ایک "مِمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰہِ" کے الفاظ سے اشارہ کر دیا گیا کہ دعوت اللہ کی طرف ہو کسی خاص فرد یا جماعت کی طرف نہ ہو۔ اور دوسرے "وَقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" میں مزید وضاحت کر دی گئی کہ داعی خود بھی صرف مسلمان ہونے کا مدعی ہو اور کسی خاص گروہ یا فرقے کی جانب اپنے آپ کو منسوب نہ کرے اور اس کی دعوت بھی صرف 'اسلام' کی طرف ہو نہ کہ کسی خاص مسلک و مشرب کی طرف۔ اس لیے کہ اللہ کے نزدیک تو دین بس اسلام ہی ہے! (اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الاسلام ○)

---

[1] فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَۃَ وَمَآ اَدْرٰکَ مَا الْعَقَبَۃُ .... الخ (سورۃ بلد)

تیسری شرط تواضع اور انکساری

قرآن حکیم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ مختصر ترین الفاظ میں وسیع ترین مفہوم کو بیان کر دیتا ہے۔ یہاں "اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" میں ایک اور فتنے کی بیخ کنی بھی کر دی گئی ہے جس میں داعی کے مبتلا ہونے کا شدید خطرہ ہوتا ہے۔ یعنی مقام دعوت پر فائز ہونے کا تکبّر، غرور اور گھمنڈ۔ جس سے ایک طرف داعی خود راندۂ درگاہ حق ہو جاتا ہے اور دوسری طرف اس کی دعوت کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ ان الفاظ میں ایک داعیٔ حق کے قلبی تذلّل و تواضع کی کیفیت کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا کہ وہ یہ کہتا ہے کہ میں بھی بس ایک مسلمان ہی ہوں اور عام مسلمانوں سے کسی طرح بھی افضل یا اعلیٰ نہیں ہوں۔

دو فتنوں کا سدِّباب

اس طرح "اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" سے بیک وقت ایسے دو فتنوں کا سدّباب کر دیا گیا جن میں عموماً اصحاب دعوت و عزیمت کے مبتلا ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، یعنی ایک یہ کہ ان کی دعوت امّت میں ایک نئے فرقے کی پیدائش کا سبب بن سکتی ہے جس سے افتراق و انتشار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا سدّباب اس سے ہو جاتا ہے کہ داعی اور اس کے ساتھی یہ بات ہر وقت پیش نظر رکھیں کہ ہم بھی مسلمانوں ہی میں سے ہیں اور امّتِ مسلمہ ہی کا ایک جزو ہیں، کوئی علیحدہ چیز نہیں! اور دوسرے یہ کہ داعی کی اپنی شخصیت ایک نیا بُت بن جائے جس کی پرستش شروع ہو جائے۔ اس فتنے کی ابتدا اصل میں داعی کی اپنی ذات سے ہوتی ہے۔ یعنی پہلے خود اس کے اپنے دل و دماغ میں یہ خنّاس پیدا ہوتا ہے کہ میں "چیزے دیگر" ہوں۔ داعی کے قلب کا یہ احساس اس کے قریبی ساتھیوں پر منعکس ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ "پیراں نمے پرند و مریداں مے پرانند" کے مصداق داعی کی شخصیّت لات و منات اور عُزّیٰ و ہبل کی فہرست میں اضافے کا سبب بن جاتی ہے۔ اس کا سدّباب صرف اس طرح ہو سکتا ہے کہ داعی کے سامنے ہمیشہ یہ حقیقت عیاں رہے کہ "اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ" میں بھی بس ایک عام مسلمان ہوں اور اگر اللہ "وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ" کے مصداق حالتِ اسلام ہی میں اٹھا لے تو بس یہی میری سب سے بڑی کامیابی ہے!

سب سے اعلیٰ کام اور سب سے عمدہ بات!

"وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا" کے الفاظ پر بھی غور فرما لیجئے! ان الفاظ میں اس حقیقت کی جانب اشارہ ہے کہ یوں تو دنیا میں ہر صاحبِ صلاحیّت آدمی کسی نہ کسی بات کی دعوت دیتا ہی ہے، کوئی خاندان یا برادری کے مفادات کی پکار لگاتا ہے تو کوئی ملک و قوم کی عظمت کا راگ الاپتا ہے، کوئی جمہوریت کے قیام کی دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے تو کوئی اشتراکیت کے نفاذ کا داعی بنتا ہے۔ لیکن ان سب سے بہت بلند، اعلیٰ اور ارفع دعوت اس کی ہے جو اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف پکارتا اور اس کے دین کی دعوت دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے انسان کے لیے اس مرتبے سے بلند تر کوئی مرتبہ نہیں کہ وہ "داعِیًا اِلَی اللّٰہِ" اور "سِرَاجًا

منیراً، صلی اللہ علیہ وسلم سے کسب نور کرکے خود بھی ہدایت کا ایک چھوٹا سا چراغ بن جائے۔ ! وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (پس چاہیئے کہ اسی کی حرص کریں حرص کرنے والے!)

خلاصۂ کلام

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے:۔

۱۔ اُمت مسلمہ کی غرض تاسیس اور اس کا مقصد وجود ہی دعوت الی اللہ ہے اور دنیا میں اس کی عزت و سربلندی ہی نہیں بلکہ اس کے وجود و بقا کا تمام تر انحصار بھی اس پر ہے کہ وہ اپنے اس فرضِ منصبی کو کما حقہٗ ادا کرے۔

۲۔ پھر دعوتِ الی اللہ ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وفداہٗ ابی و اُمّی کی وہ سب سے زیادہ مؤکد سنت ہے جس پر آپ کا تواتر عمل ظاہر و باہر ہے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کا اوّلین تقاضا بھی یہی ہے کہ آپ کی سنّتِ دعوت کا اتباع کیا جائے!

۳۔ مختلف مذہبی جماعتوں اور فرقوں نے اپنے اپنے مسلک و مشرب کی اشاعت و توسیع کے لیے مبلّغین کی جو 'سول سروس' جاری کی ہوئی ہے۔ وہ دعوتِ الی اللہ کے نقطۂ نظر سے نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہے بلکہ الٹی مضر ہے!

۴۔ دعوتِ الی اللہ کے اصل لوازم ایمان اور عمل صالح ہیں نہ کہ فروعاتِ دین کا علم۔ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پر یقین واثق اور اعمال صالح و اخلاقِ حسنہ کے امتزاج جمیل کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ داعی میں تواضع و انکسار پایا جائے اور اس کی دعوت بھی محض اللہ اور اس کے دین کی طرف ہو تاکہ نہ اس کی اپنی شخصیت ایک نیا بُت بن سکے۔ اور نہ ہی اس کے حلقہ بگوش ایک نئے فرقے کی صورت اختیار کرسکیں۔

۵۔ دعوت الی اللہ کے بہت سے پہلو اور بے شمار مدارج و مراتب ہیں۔ اور آج کی گفتگو کا اصل موضوع دعوت الی اللہ کی وہ ابتدائی اور بنیادی منزلیں ہیں جن تک ہر باشعور مسلمان کی رسائی ممکن بھی ہے اور لازم بھی!

اُسوۂ حسنہ

اب میں آپ کی توجہ سیرت محمدی علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسّلام کے ان واقعات کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جو بعثت کے فوراً بعد پیش آئے تاکہ ایک طرف دعوت الی اللہ کے اصل مبادی و اصول اور اس کا صحیح منہج و اسلوب واضح ہو جائے اور دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہو جائے کہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت کے ابتدائی دور میں وہ تمام مشکلات پیش آئیں اور ان تمام دل شکنیوں کا سامنا کرنا پڑا جو کسی بھی دعوت کے ابتدائی ایام میں پیش آنی لازمی ہیں۔ اور آپ نے بعینہٖ انہی فطری طریقوں کو اختیار فرمایا جو کسی بھی شخص کو کسی دعوت کے پیش کرنے کے لیے لازماً اختیار کرنے پڑتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کی زندگی بھی اخلاق حسنہ کا ایک کامل

نمونہ تھی اور آپ کی سیرت و اخلاق پر کسی قسم کا کوئی داغ یا دھبّہ موجود نہ تھا آپؐ نے اپنے حسنِ اخلاق اور راست معاملگی کی بدولت اپنے معاشرے سے 'الصّادق' اور 'الامین' کے خطابات حاصل کئے تھے۔ یہ واضح رہنا چاہیئے کہ آپؐ نے یہ خطابات زندگی کی عین منجدھار میں رہتے ہوئے حاصل فرمائے تھے نہ کہ اس سے دور کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر۔ آپؐ ہمیشہ اپنی سوسائٹی میں ایک فعّال فرد کی حیثیت سے شریک رہے حتیٰ کہ آپؐ نے اس وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر کاروبار بھی فرمایا اور حقیقت یہ ہے کہ دراصل اسی میدان میں آپؐ کی 'صداقت' اور 'امانت' کے اصل جوہر نمایاں ہوئے۔ بعد میں جب آپؐ 'دعوت الی اللہ' کے منصب پر فائز ہوئے تو اس وقت آپؐ کی دعوت کی تاثیر میں جہاں اس بات کو دخل ہے کہ خود وہ دعوت فطرتِ انسانی کے نہایت قریب اور عقلِ صحیح و طبعِ سلیم کی جانی پہچانی تھی وہاں اس امر کو بھی فیصلہ کن حد تک دخل حاصل ہے کہ اس کا پیش کرنے والا 'الصادق' اور 'الامین' تھا۔ صلّی اللہ علیہ وسلّم و فداہٗ ابی و اُمی!

قربِ بعثت کے زمانے میں آپ پر تفکّر کا غلبہ ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ "حاضر و موجود"[1] سے بیزاری اور حقیقتِ نفس الامری کی تلاش و جستجو کا جذبہ بڑھتا چلا گیا۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ "ثُمَّ حُبِّبَ اِلَيْهِ الْخَلَاءُ فَكَانَ يَخْلُوْ بِغَارِ حِرَاءٍ فَيَتَحَنَّثُ فِيْهِ" کہ پھر آپؐ کو خلوت گزینی محبوب ہو گئی۔ چنانچہ آپؐ غارِ حرا میں خلوت گزیں ہوتے تھے اور وہاں عبادت فرماتے تھے۔ شروحِ حدیث میں اس عبادت کی نوعیت التفکّر والاعتبار یعنی غور و فکر اور عبرت پذیری بیان ہوئی ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ سلسلہ کتنے عرصے چلا۔ بہرحال وہ وقت آگیا کہ 'تلاشِ حقیقت میں سرگرداں' کو 'ہدایتِ تامہ' حاصل ہوئی[2] یعنی وحی کا سلسلہ شروع ہوا، حقیقت پر سے پردے اٹھا دیئے گئے۔ آپ کو منصبِ نبوّت عطا ہوا اور آپ 'دعوت الی اللہ' کے علمبردار اور قرآن مجید کے الفاظ میں "شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا" بنا دیئے گئے۔ فصلّی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ اجمعین۔

بعثت کے فوراً بعد دعوت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چنانچہ فطری طور پر سب سے پہلے ان قریب ترین لوگوں کو دعوت دی گئی جن کے ساتھ آپ کا اٹھنا بیٹھنا رہا تھا اور جو آپ کے اخلاق و عادات سے سب سے زیادہ واقف تھے یعنی زوجہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ، چچا زاد بھائی جنہوں نے آپ ہی کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی تھی یعنی حضرت علیؓ، آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ اور جگری دوست حضرت صدیق اکبرؓ۔ چنانچہ یہ سب

؎۱ ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق — جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے (اقبال)

؎۲ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (سورۃ والضحیٰ) - ترجمہ: پایا تمہیں تلاشِ حق میں سرگرداں، تو ہدایت دی!

حضرات پہلے ہی دن ایمان لے آئے اور یہیں سے "دعوت الی اللہ" کا پہلا سبق واضح ہوا یعنی یہ کہ یہ گھر سے شروع ہوتی ہے اور اس کا اوّلین میدان انسان کے قریب ترین اعزّہ و اقارب ہیں یا عزیز ترین احباب و احباب۔!

پھر ان "سابقون السابقین" نے "اتباع سنّت" کا جو مفہوم سمجھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنّتِ دعوت، کا جس طور سے اتباع کیا اس کی سب سے درخشاں مثال حضرت صدّیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قائم فرمائی کہ داعیِ اعظم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اتباع میں خود بھی فوری طور پر داعی بن گئے اور یہ ان ہی کی دعوت و تبلیغ کا اثر تھا کہ "سابقون الاولون" کے سرگروہ اور گلِ سرسبد عثمان غنیؓ، عبدالرحمٰنؓ ابن عوف، طلحہؓ، زبیرؓ، سعدؓ بن ابی وقاص، ابوعبیدہؓ ابن الجرّاح، عثمانؓ بن مظعون وغیرہم اللہ کے دین میں داخل اور امّتِ محمدیؐ میں شامل ہوئے۔ فجزاہ اللہ عن جمیع المسلمین والمسلمات خیر الجزاء یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ محبّتِ رسولؐ کا اصل تقاضا آپؐ کی سنّتِ دعوت کا اتّباع ہے۔ واضح رہے کہ حضرت ابوبکرؓ صدّیق کوئی زاویہ نشین یا گوشہ گیر انسان نہ تھے۔ بلکہ معاشرے کے ایک متموّل اور بااثر شخص اور ایک نہایت کامیاب تاجر تھے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ میں نے ہر شخص کے احسانات کا حساب چکا دیا، سوائے ابوبکرؓ کے، ان کے احسانات کا بدلہ میں نہیں دے سکتا۔ اللہ ہی دے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی بالکل ابتدائی دَور کی دعوت و تبلیغ سے امّتِ محمدیہ کو ان مایہ ناز ہستیوں کا تحفہ دے کر جو احسان عظیم کیا ہے پوری امّت اس کا بدلہ چکانے سے تاقیامت معذور رہے گی!! یہ "دعوت الی اللہ" "شجرہ طیّبہ" کی ایک شاخ کا ذکر تھا جو تمام شاخوں میں سب سے بڑی تھی۔ لیکن تنہا نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے جو شخص بھی اس دعوت پر ایمان لایا وہ فوری طور پر خود بھی اس کا داعی بن گیا۔

"اصلِ ثابت کی طرف رجوع کیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو حکم ملا "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" اپنے قریبی عزیزوں کو خبردار کرو۔ سوچئے! آج بھی کسی کو حکم ہو کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو کوئی پیغام پہنچا دو تو وہ اس کے لیے سب سے اچھا طریقہ کونسا اختیار کرے گا؟ آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے پورے گھرانے یعنی بنو ہاشم کی دعوت کا اہتمام فرمایا۔ چالیس کے لگ بھگ آدمیوں کو کھانا کھلانے کے بعد ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنی چاہی، لیکن ابولہب کی بکواس نے اس کا موقع ہی نہ دیا اور مجلس ویسے ہی برخاست ہو گئی۔ سوچئے کتنی دل شکنی اور کیسی مایوسی کا سامنا حضورؐ کو ہوا ہو گا۔ لیکن "داعی الی اللہ" کے لئے مایوسی کا کیا سوال، پھر اہتمام فرمایا۔ دوبارہ کھانا کھلایا۔ اور پھر دعوت فرمائی۔ روایت ہے کہ بھرے مجمعے میں سے صرف ایک نوجوان، جسے نوجوان کے بجائے بچہ ہی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ ایسا نکلا جس نے ساتھ دینے کا وعدہ

کیا۔ چشم تصور سے دیکھئے کہ اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاندان کو اللہ کی طرف بلاتا ہے۔ لیکن کوئی ایک متنفس بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا، حضرت علیؓ تو پہلے ہی سے اپنے تھے ان دونوں دعوتوں کا حاصل تو صفر ہی رہا ہے ہی تو مواقع تھے جن پر وحی الٰہی تسلی و تشفی کے لیے اترتی تھی کہ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا[1] اور فَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ[2]۔

حکم ہوا۔ "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" جس بات کا تجھے حکم ملا ہے اسے برملا اور علی الاعلان کہہ! آپ نے وقت کے رواج اور دستور کے مطابق کوہ صفا پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا "واصباحاہ" لوگو! خطرہ درپیش ہے۔ فوراً جمع ہو جاؤ۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے "پہاڑی کا وعظ" ارشاد فرمایا۔ ارشاد ہوا، "اے معشر قریش! اگر میں تم سے کہوں کہ پہاڑ کے عقب سے ایک لشکر آ رہا ہے تو تم کو یقین آئے گا؟" سب نے کہا "کیوں نہیں؟ جبکہ ہم نے آپ کو ہمیشہ سچ بولتے ہی دیکھا ہے!" تب آپ نے فرمایا "تو میں یہ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان نہ لاؤ گے تو تم پر دردناک عذاب نازل ہوگا!"۔ لوگ سخت برہم ہوئے اور کہتے ہیں کہ اسی موقع ابولہب نے کہا تھا "تَبًّا لَكَ، أَلِهَذَا جَمَعْتَنَا" تیرے ہاتھ ٹوٹ جائیں کیا بس اسی لیے تو نے ہمیں جمع کیا تھا جس پر سورہ لہب نازل ہوئی کہ ہاتھ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نہیں بلکہ ابولہب کے ٹوٹ چکے!۔ لیکن ابولہب کے ہاتھوں کا ٹوٹنا تو ابھی عالم امر میں تھا۔ عالم واقعہ میں تو اس کا ظہور تو بہت بعد میں ہوا۔ اس وقت جو صورت بالفعل موجود تھی وہ تو یہی تھی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم گویا اندھوں اور بہروں کے سامنے اپنی دعوت پیش فرما رہے تھے جس کا قبول کرنے والا کوئی نہ تھا۔ "پہاڑی کے اس وعظ" کا تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اصل دلیل داعی کی صداقت و امانت کا وہ عام اقرار ہے جو سوسائٹی میں موجود تھا اور مقام نبوت کی وضاحت کے لیے موقع اور محل کے اعتبار سے بہترین تمثیل پیش کی گئی ہے کہ جیسے بلندی پر کھڑا ایک شخص دونوں طرف دیکھ رہا ہوتا ہے جبکہ پستی میں کھڑے لوگ دوسری طرف کے حالات سے واقف نہیں ہو سکتے اسی طرح نبوی کی نگاہ میں دنیا و آخرت دونوں ہوتے ہیں، جبکہ عام انسانوں کی نگاہیں دنیا کے بھی صرف ظاہر تک محدود ہوتی ہے۔ يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ[3]

اس طرح رفتہ رفتہ دعوت کا حلقہ وسیع ہوا، اللہ ہی جانتا ہے کہ ایسے کتنے اجتماعات کو آپؐ نے خطاب فرمایا۔ کتنے لوگوں سے ان کے گھروں میں جا کر ملاقات کی اور ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کی۔ دھن کا عالم یہ تھا کہ

---

[1] اپنے پروردگار کے فیصلے کا انتظار کر۔ تو ہماری نگاہوں میں ہے! [2] پس صبر کر اور تیرا صبر اللہ ہی کے بھروسے پر ہے۔
[3] سورۂ روم۔ یہ لوگ واقف ہیں حیات دنیوی کے بھی بس ظاہر ہی سے اور آخرت سے تو پورے غافل ہیں ہی!

جب بھی معلوم ہوا کہ کوئی قافلہ باہر سے آیا ہوا ہے یا کوئی نووارد مکے میں موجود ہے۔ آپ اس کے پاس پہنچ جاتے اور اپنی دعوت پیش فرماتے۔ اسی سے دعوت اور تعلیم و تدریس کا فرق واضح ہوتا ہے معلّم و مدرّس یوں در در کی ٹھوکریں نہیں کھاتے بلکہ وہ مطلوب و مرجع ہوتے ہیں اور طالبانِ علم ان کے پاس آتے اور ان کی ناز برداریاں کرتے ہیں جبکہ داعی طالب ہوتا ہے اور لوگ مطلوب، وہ گھر گھر جاتا ہے ہر دروازے پہ دستک دیتا ہے، ہر گوش تک اپنی آواز پہنچاتا ہے، لوگ تمسخر کرتے ہیں، تعذیب سے بھی نہیں چوکتے، جھٹلاتے اور دھتکارتے ہیں تو "داعی الی اللہ" رات کے وقت اپنے رب کے حضور میں عاجزی و فروتنی کے ساتھ گڑگڑا گڑگڑا کر ان کی ہدایت کے لیے دعائیں کرتا ہے اور ایک ایک کا نام لے کر درخواست کرتا ہے کہ "باری تعالیٰ! عمر ابن الخطاب یا عمرو بن ہشام میں سے کوئی ایک تو مجھے ضرور ہی عطا فرما دے!" ایک طرف یہ اور دوسری طرف یہ بھی نگاہ میں رہے کہ "داعی الی اللہ" کے سینے میں پتھر کا ٹکڑا نہیں بلکہ ایک انتہائی حساس قلب ہوتا ہے جو ابنائے نوع کے کفر و انکار پہ بری طرح تڑپتا ہے، ان کے انجام بد کے تصور سے اس پر غم و اندوہ کی جو حالت طاری ہوتی ہے اس سے اس پر عین عالم شباب میں بڑھاپے کے آثار طاری ہو جاتے ہیں اور وحی الٰہی کو بار بار تسلی و تشفی ہی نہیں محبت آمیز تنبیہ بھی کرنی پڑتی ہے کہ "لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝" اور "لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝" اے رسولؐ کیا تم ان کے کفر و انکار پر صدمے سے اپنے آپ کو ہلاک کر لو گے؟ ہم نے یہ قرآن تم پر اس لیے تو نہیں اتارا کہ تم ایسی سخت مشقت میں پڑ جاؤ۔ "طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝"

دعوت کے اساسی نکات

بات طویل ہو جائے گی۔ دعوت کے اس ابتدائی مرحلے کے بعد تعذیب و ابتلا کا جو دور شروع ہوا اور جن صبر آزما اور جاں گسل حالات سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقائے کرام کو گذرنا پڑا وہ اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا میں اپنی آج کی گفتگو کو "دعوت الی اللہ" کی صرف ابتدائی منزلوں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ البتہ اس گفتگو کو ختم کرنے سے قبل میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خطبہ آپ کو ضرور سنانا چاہتا ہوں جو یقیناً اسی ابتدائی دور کا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوگا کہ "دعوت الی اللہ" کے اساسی و بنیادی نکات کیا ہیں اور اس میں اوّل اوّل کن امور پہ زور دیا جاتا ہے! خطباتِ نبویؐ کی کتابوں میں یہ خطبہ ان الفاظ میں نقل ہوا ہے۔

"اِنَّ الرَّائِدَ لَا يَكْذِبُ اَهْلَهٗ — لوگو! تم جانتے ہو کہ رائد اپنے قافلے والوں کو کبھی
وَاللّٰهِ لَوْ كَذَبْتُ النَّاسَ جَمِيْعًا — دھوکا نہیں دیتا۔ خدا کی قسم! اگر (بفرض محال) میں

مَا كَذَبْتُكُمْ وَلَوْ غَرَرْتُ النَّاسَ جَمِيْعًا مَا غَرَرْتُكُمْ۔

تمام انسانوں سے جھوٹ کہہ سکتا تب بھی تم سے کبھی نہ کہتا اور اگر تمام انسانوں کو فریب دے سکتا تب بھی تمہیں کبھی نہ دیتا۔

وَاللّٰهِ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِنِّيْ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ خَاصَّةً وَاِلَى النَّاسِ كَافَّةً

اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں! میں اللہ کا رسول ہوں، تمہاری طرف خصوصًا اور پوری نوع انسانی کی طرف عمومًا!

وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ۔

خدا کی قسم تم سب مر جاؤ گے جیسے (روزانہ) سو جاتے ہو!

ثُمَّ لَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ

پھر یقینًا اٹھائے جاؤ گے جیسے (ہر صبح) بیدار ہو جاتے ہو۔

ثُمَّ لَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ

پھر لازمًا تمہارے اعمال کا حساب کتاب ہوگا

ثُمَّ لَتُجْزَوُنَّ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَبِالسُّوْءِ سُوْءً۔

اور پھر لازمًا تمہیں بدلہ ملے گا۔ اچھائی کا اچھا اور برائی کا برا۔

وَاِنَّهَا الْجَنَّةُ اَبَدًا اَوْ لَنَّارُ اَبَدًا"

اور وہ جنت ہے ہمیشہ کے لیے یا آگ ہے دائمی"۔

اپنے اس خطبے میں بھی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبی کے لیے انتہائی بلیغ مثال رائد کی دی ہے۔ رائد کسی قافلے کا وہ معتمد ترین فرد ہوتا تھا جو سفر کی اگلی منزل کا تعین کرتا تھا اور قافلے سے آگے جا کر معلوم کرتا تھا کہ کس جگہ پڑاؤ مناسب رہے گا کہ پانی اور چارے کی سہولتیں فراہم ہوں ظاہر ہے کہ 'رائد' کے صدق و امانت پر ہی پورے قافلے کی سلامتی کا دارومدار تھا۔ اور اس کی ذرا سی غلط بیانی پورے قافلے کی ہلاکت کا سبب بن سکتی تھی۔ یہی حال 'نبی' کا ہوتا ہے کہ وہ قافلۂ دنیا کو منزل آخرت کی خبر دیتا ہے اور یہاں کی مدہوشی و غفلت پر وہاں کے دردناک انجام سے خبردار کرتا ہے۔ اس انتہائی بلیغ پیرائے میں اپنے مقام و منصب کو واضح فرما کر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم خدا کی توحید اور اپنی رسالت کی خبر دیتے ہیں اور پھر پورا زور اس بات پر صرف کر دیتے ہیں کہ غافلو ہوشیار ہو جاؤ نیند کے ماتو جاگو۔ جیسے روزانہ شام ہوتی ہے۔ ایسے ہی تمہاری پوری زندگی کے دن پر بھی ایک شام آئے گی، اور جس طرح تم پر روز نیند طاری ہو جاتی ہے اسی طرح اس شام کو موت تمہیں اپنی آغوش لے لیگی۔ پھر جس طرح تم روزانہ صبح بیدار ہو جاتے ہو اسی طرح ایک دن تمہیں موت کی نیند سے اٹھا لیا جائے گا۔ (فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۝[1]) پھر تمہارے زندگی بھر کے

[1] سورۂ مدثر: پھر وہ دن بڑا ہی سخت دن ہے۔ منکروں پر ہرگز آسان نہیں!

اعمال کا حساب ہوگا اور پھر بدلہ مل کر رہے گا۔ بھلائی کا بھلائی سے یعنی ہمیشہ کے لیے جنت اور برائی کا برائی سے یعنی ہمیشہ کی آگ۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعوت الی اللہ کے بنیادی اور اساسی نکات تو تین ہیں یعنی توحید، رسالت اور معاد لیکن ان میں بھی ابتداءً اصل زور آخرت کے محاسبے اور جزا و سزا سے خبردار کرنے پر ہونا چاہیئے۔ پورا قرآن مجید اور خصوصاً ابتدائی مکیات اس پر شاہد عادل ہیں۔ اور دعوت کا جو پہلا حکم آنحضورؐ کو دیا گیا وہ تو اس پر آخری دلیل اور قطعی حجت ہے۔ ارشاد ہوا یٰاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ! "اے کپڑے میں لپٹ کر لیٹنے والے! کھڑا ہو اور خبردار کر!"۔ اور "وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ" اور ڈرا اپنے قریبی رشتہ داروں کو۔ دنیا میں نظام دین و شریعت کا نفاذ و قیام 'دعوت الی اللہ' کا ہدف تو یقیناً ہے۔ لیکن اسے ہدف بعید کہنا چاہیئے۔ اس کا اولین ہدف ابنائے نوع کی انفرادی فلاح و نجات ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال ایسی ہے کہ جیسے آگ کا ایک بڑا الاؤ ہے اور تم اس میں گر پڑنے کو تیار ہو اور میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر اس میں گرنے سے روک رہا ہوں۔ پھر ظاہر ہے کہ جس سے جتنی زیادہ محبت ہو اتنا ہی وہ اس دعوت میں مقدم ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ خاص اپنے گھرانے کے افراد کو لے کر بیٹھتے تھے اور فرماتے تھے۔ یا فاطمة بنت محمدؐ انقذی نفسک من النار فانی لا املک لکِ من اللہ شیئًا و یا صفیة عمة رسول اللہ انقذی نفسکِ من النار فانی لا املک لکِ من اللہ شیئًا" اے فاطمہؓ، محمدؐ کی بیٹی، اور اے صفیہؓ اللہ کے رسول کی پھوپھی! خود اپنے آپ کو آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس لئے کہ اللہ کے یہاں مجھے تمہارے بارے میں کوئی اختیار نہ ہوگا۔!"

حضرات! یہ ہیں 'دعوت الی اللہ' کے اصول و مبادی اور یہ ہے اس کا اسلوب و منہج۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو آج کی اس مجلس سے یہ فیصلہ کر کے اٹھیں کہ ہم ان اصول اور اس اسلوب پر 'دعوت الی اللہ' کا کام کریں گے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی 'سنتِ دعوت' کا اتباع کریں گے۔ میں نے اپنی اس گفتگو کو دعوت کے ابتدائی مراحل تک اس لیے محدود رکھا ہے کہ مجھے یقین ہے اور میں علیٰ وجہ البصیرت جانتا ہوں کہ اگر اس اسلوب پر 'دعوتِ الی اللہ' کے چھوٹے چھوٹے چراغ اور ننھے ننھے دیئے ہمارے شہروں، بستیوں اور قصبوں میں روشن ہو گئے تو پھر اس دعوت کے اعلیٰ مقامات اور بلند تر منازل کا سامان بھی فراہم ہو جائے گا اور نہ صرف یہ کہ ایک ایسی اجتماعی قوت بہم پہنچ جائے گی جو امّت محمدؐ کے جملہ اخلاقی و روحانی عوارض کا مداوا کرے اور۔ وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ

وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ اُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝[1]
کی مصداق بن جائے۔ بلکہ وہ دن بھی دور نہ رہے گا جب یہ امّت بحیثیت مجموعی 'دعوت الی اللہ' کے فریضے کو ادا کرے گی اور "کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" کی صحیح معنیٰ میں مصداق ہو گی اور تمام نوعِ انسانی پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے جانب سے اتمامِ حجّت کرے گی۔ "لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ" اس کے برعکس اگر ترتیب یہ رہے کہ بلند بانگ دعاوی سے کام شروع کیا جائے اور پہلے ہی قدم پر 'عالمی انقلاب' کا نعرہ لگایا جائے اور نجاتِ اخروی کا بس تبرکاً تذکرہ کر کے قیامِ حکومتِ الٰہیہ اور نفاذِ نظامِ اسلامی کو اوّلین ہدف بنا کر جدوجہد شروع کی جائے تو بسا اوقات چند ہی قدم چل کر انسان ہار جاتا ہے اور خود اپنی طے کردہ راہ کی کسی ادنیٰ سی چیز کو اپنا "عبوری نصب العین" قرار دے کر بس اسی کا ہو رہتا ہے۔

فَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ! ——— اقول قولی هٰذا
وَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِیْ وَ لَكُمْ وَ لِسَائِرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَ الْمُسْلِمَاتِ۔
وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور
کی تازہ پیش کش
مبتدی حضرات کے لئے عربی سیکھنے کا آسان ذریعہ
عربی کے پچیس ۲۵ آسان اسباق
تالیف : محمّد یار راضی
۳۰×۲۰/۸ پر ۶۴ صفحات، سفید کاغذ، طباعت آفسٹ، قیمت فی نسخہ : ۲/-

[1] سورۂ آل عمران "اور چاہیئے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم دے اچھے کاموں کا اور منع کرے برائی سے۔ اور وہی پہنچے اپنی مراد کو!"

Guest House Expenses	...	...	...	...	585.76
News Papers/Magazines	...	...	...	...	158.90
Travelling Expenses	...	...	...	...	1,459.32
Miscellaneous Expenses	...	...	...	...	2,069.06
Tape Recorder Expenses	...	...	...	...	211.00
Bank Charges	...	...	...	...	26.90
Quran Conference Expenses		...	...	...	6,862.50
*Al-Kuliat-ul-Arabia (Net)		...	...	...	3,268.41
*Payment to Maktaba	...	...	...	...	1,08,081.00
Purchase of Assets	...	...	...	...	
Library ...	300 00				
Furniture ...	1,806.00				
Tape-Recorder ...	2,849.30	...	...	...	4,955.50
Publicity ...	...	...	...	...	483.50
Cash 31st December, 1973					
in hand ...		498.68			
With Bank ...		34,928.11			
Cash Advances ...	907.25				
Deposits Payable ...	1632 00	(724.75)	...	...	34,702.04
				Total Rs.	1,80,909.00

Sd.
(Qamar Saeed Qureshi)
Chief Organiser (ناظم اعلیٰ)

Sd,
(Mian Mohammed Rashid)
Treasurer (ناظم بیت المال)

Sd.
(Haji Mohammed Yousuf)
Internal Auditor (محاسب)

*For details see Annexures 'A' & 'B' on cover page 2.

Monthly "MEESAAQ" Regd. No. L. 7360 Lahore

Vol. 21 | NOVEMBER 1974 | No. 10-1

RECEIPTS & PAYMENTS ACCOUNT

MARKAZI ANJUMAN KHUDDAM-UL-QURAN LAHORE

(FROM THE PERIOD 4TH NOVEMBER 72, TO 31st DECEMBER 1973)

DULY AUDITED BY

M/s. HAMEED CHAUDHRI & COMPANY

CHARTERED ACCOUNTANTS

RECEIPTS

Initial Contribution of Founder Members (مؤسسین)	...	1,00,000.00
,, ,, ,, Mohsineen (محسنین)	... ...	25,000.00
,, ,, ,, Permanent Members (مستقل ارکان)	...	12,000.00
Monthly Contributions	...	19,252.00
General Contributions	...	21,927.00
Zakat	...	2,550.00
Misc : Receipts	...	180.00
	Total Rs.	1,80,909.00

PAYMENTS

Staff Salaries	...	2,297.42
Postage, Telegram & Telephone	...	1,430.50
Stationery & Printing	...	664.60
Rent	...	13,000.00
Electricity Expenses	...	400 59
Sui Gas ,, ...	...	252.00

Contd. on cover page 3

پبلشر : محی الدین ، طابع : شیخ محمد اشرف مالک اشرف پریس ایبک روڈ ۔ لاہور
مقام اشاعت : ۱۲۔ افغانی روڈ ، سمن آباد ، لاہور (فون : ۶۸۲۰۵)